درس ۱۷

جہاد وقتالِ فی سبیل اللہ کے موضوع پر

قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سُورۃ الصَّف

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا ہم سلسلہ وار مطالعہ کر رہے ہیں اس کے چوتھے حصے میں سورۃ الحج کے آخری رکوع کے بعد اب ہمیں بالترتیب سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا مطالعہ کرنا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ایک حسین وجمیل جوڑے کی صورت میں ''سلسلۂ مُسَبِّحات'' کے بالکل وسط میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سے قبل سورۃ التحریم کے درس کے ضمن میں بھی یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ کسی ایک مضمون پر' جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں' بالعموم دو علیحدہ سورتوں میں بحث ہوتی ہے اور دونوں سورتیں مل کر اس ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتیں اور آیات

اس مرحلے پر چونکہ ہم قرآن حکیم کی ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے' لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مصحف کی ترتیب سے متعلق اور سورتوں کی گروپ بندی (grouping) کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں عرض کر دی جائیں' تاکہ قرآن مجید کے ساتھ ایک مجموعی اور عمومی تعارف اور اس کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہونے میں مدد مل سکے۔

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی اکائی ''آیت'' ہے اور قرآن حکیم چھ ہزار سے زائد آیات پر مشتمل ہے۔ آیت کے معنی ہیں نشانی۔ اس لفظ سے دراصل اس حقیقت کی جانب رہنمائی ملتی ہے کہ قرآن حکیم کی ہر آیت علم وحکمت کا ایک موتی اور اللہ کے علمِ کامل اور اس کی حکمتِ بالغہ کی نشانی ہے۔ بعض آیات صرف حروفِ مقطّعات پر مشتمل ہیں' بعض مرکباتِ ناقصہ پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو مکمل جملوں پر مشتمل ہیں' جبکہ ایسی بھی بہت سی آیات ہیں جن میں متعدد جملے آ جاتے ہیں۔ یہ معاملہ کسی لغوی' نحوی یا اجتہادی اصول پر مبنی نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ تمام اُمور توقیفی ہیں' یعنی نبی اکرم ﷺ کے بتانے ہی سے اُمت کو معلوم ہوئے ہیں۔

آیات جمع ہو کر سورتوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ سورتوں کی کُل تعداد ایک سو چودہ ہے جو متفق علیہ ہے۔ ''سورۃ'' کے لغوی معنی ''فصیل'' کے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے گویا یہ نقشہ سامنے لے آیا گیا کہ قرآن حکیم کی ہر سورۃ علم وحکمت کا ایک شہر ہے' جس کے گرد ایک فصیل موجود ہے۔ آیات ہی کی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی ہیں۔ سب سے چھوٹی سورتیں تین ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ انہی میں سے ایک سورۃ العصر ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز ہے۔ بقیہ دو سورتیں' سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر ہیں۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورتیں وہ ہیں جو سورۃ الفاتحہ کے بعد مصحف کے بالکل آغاز میں آئی ہیں۔ یعنی سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران' سورۃ النساء' سورۃ المائدۃ' سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف۔ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ بعض سورتیں وہ ہیں جو بیک وقت ایک مربوط اور مسلسل خطبے کی شکل میں نازل ہوئیں' لیکن بہت سی سورتوں میں تدوین وترتیب کا معاملہ بھی ہوا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے حکم کے تحت ہوا ہے' کہ بعض آیات نازل ہوئیں اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اِن آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں آیتوں کے بعد رکھ دو! بہرحال یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رہنمائی میں نبی اکرم ﷺ نے خود معین فرمائی۔

سات احزاب

سورتوں کی ایک تقسیم جو بہت معروف ہے وہ ان کے زمانۂ نزول کے حوالے سے ہے۔ کچھ سورتیں مکی ہیں‘ کچھ مدنی ہیں۔ یعنی کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں اور کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

اب ترتیبِ مصحف کی طرف آیئے اور سورتوں کی گروپنگ کو سمجھنے کی کوشش کیجیے! یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب‘ جس سے ہم واقف ہیں اور جو دَورِ نبویؐ سے چلی آ رہی ہے‘ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے نہیں ہے اور یہ بات اظہر من الشّمس ہے‘ اس پر کچھ مزید عرض کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اس ترتیبِ مصحف میں سورتیں جس طرح ایک دوسرے کے بعد رکھی گئی ہیں اور اِن میں جو گروپ بندی کی گئی ہے ان میں سے ایک گروپ بندی (grouping) تو وہ ہے جس کا ذکر ہمیں دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے ملتا ہے‘ جس کی رو سے قرآن حکیم کی سورتیں سات احزاب یا سات منزلوں میں منقسم ہیں۔ یہ درحقیقت بغرضِ تلاوت قرآن حکیم کو سات قریباً مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ آغاز میں تقریباً ہر مسلمان ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت مکمل کیا کرتا تھا‘ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن حکیم کو سات تقریباً مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے‘ تاکہ ایک شخص روزانہ ایک حصہ‘ ایک حزب یا ایک منزل پڑھ کر ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا کرے۔ یہ تقسیم‘ جیسا کہ عرض کیا گیا‘ دورِ صحابہؓ میں موجود تھی۔ اس تقسیم میں ایک ظاہری حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو چھوڑ کر‘ کہ یہ پورے قرآن مجید کے لیے ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے‘ پہلی منزل یا پہلا حزب تین سورتوں پر مشتمل ہے‘ دوسرا پانچ سورتوں پر‘ تیسرا سات سورتوں پر‘ چوتھا نو سورتوں پر‘ پانچواں گیارہ سورتوں پر اور چھٹا تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے‘ جبکہ ساتویں حزب میں‘ جو کہ ’’حزبِ مفصل‘‘ کہلاتا ہے‘ سورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے‘ اس لیے کہ قرآن مجید کے آخر میں حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں جمع ہیں۔

پارے اور رکوع

سات منزلیں یا سات احزاب تو دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں موجود تھے‘ البتہ دو تقسیمیں بعد میں کی گئی ہیں جن کا دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں ذکر نہیں ملتا۔ ایک قرآن حکیم کی تیس پاروں میں تقسیم ہے‘ جو درحقیقت اُس دَور کی تجویز کردہ ہے جب مسلمانوں کا جذبۂ ایمان کچھ مدھم پڑ گیا تھا اور تلاوتِ قرآن کے ضمن میں وہ سابقہ معمول‘ کہ ہر ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا جائے‘ اب کچھ لوگوں پر گراں گزر رہا تھا۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کو تیس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے‘ تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک حصہ پڑھ کر ایک مہینے میں تلاوتِ قرآن مکمل کر لیا کرے۔ لیکن یہ تقسیم فی الواقع بڑی ہی مصنوعی اور بے قاعدہ (arbitrary) ہے اور قطعی طور پر کسی بھی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس میں یہ ظلم بھی کیا گیا ہے کہ سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں اور نہایت بھونڈے طریقے سے توڑی گئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں جبکہ بقیہ پوری سورت چودھویں پارے میں چلی گئی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی کے پاس قرآن حکیم کا کوئی ایک نسخہ تھا اور اس نے اس کے صفحات گن کر اُسے برابر برابر تیس حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک میں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں بالعموم ان پاروں کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔

ایک دوسری تقسیم جو کی گئی‘ اور وہ بھی بغرضِ سہولتِ تلاوت کی گئی‘ وہ ہے سورتوں کی تقسیم رکوعوں میں۔ اس میں پیشِ نظر یہ تھا کہ طویل سورتوں کو جن کا نماز کی ایک رکعت میں پڑھنا مشکل ہے‘ اس طرح کے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصہ ایک رکعت میں بآسانی پڑھا جا سکے۔ اس طرح طویل سورتیں رکوعوں میں منقسم ہو گئیں۔ آخری پارے کی اکثر سورتیں صرف ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں‘ اس لیے کہ ان کو ایک رکعت میں بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پیچھے کی طرف آیئے تو ذرا طویل سورتیں ہیں جو دو دو رکوعوں کی سورتیں ہیں۔ پھر مزید طویل سورتیں ہیں جو تین تین اور

چار چار رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ‘ سورۃ البقرۃ ہے جو چالیس رکوعوں پر مشتمل ہے۔ یہ تقسیم جس نے بھی کی ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس نے مضامین کا لحاظ رکھا ہے۔ عام طور پر رکوع کا اختتام ایسے ہی موقع پر کیا گیا ہے کہ جہاں ایک مضمون مکمل ہو جائے اور سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ بہرحال پاروں اور رکوعوں کی یہ تقسیم دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی‘ یہ بعد کے زمانے سے متعلق ہے۔

سورتوں کی ایک نئی گروپ بندی

البتہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپ بندی اور بھی ہے جس کی جانب ماضی قریب ہی میں بعض محققین کی نگاہ گئی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ مکی اور مدنی سورتوں کو کچھ اس طرح آپس میں جوڑا گیا ہے‘ اکٹھا کیا گیا ہے کہ اس سے سات گروپ وجود میں آ گئے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے‘ اور اس طرح مکی اور مدنی سورتیں مل کر ایک گروپ کو مکمل کرتی ہیں۔ ایک گروپ کے مکمل ہونے پر آپ دیکھیں گے کہ دوسرا گروپ شروع ہوگا‘ پھر آغاز میں مکّیات آئیں گی اور اُن کے بعد پھر مدنیات۔ اور اس طرح دوسرا گروپ مکمل ہو جائے گا۔ پھر تیسرے گروپ کا آغاز بھی ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوگا‘ جن کے بعد پھر مدنی سورتیں آئیں گی اور گروپ مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح مکی اور مدنی سورتوں کے بھی سات ہی گروپ سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہے جو اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہر گروپ کا ایک مرکزی خیال یا ایک عمود (central axis) ہوتا ہے جس کے ساتھ اس گروپ کی تمام مکی اور مدنی سورتیں مربوط ہوتی ہیں۔

اس طرح سے قرآن مجید کی سورتوں کے جو سات گروپ وجود میں آئے ہیں ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورۃ صرف ایک ہے‘ یعنی سورۃ الفاتحہ‘ جبکہ اس گروپ میں چار انتہائی طویل مدنی سورتیں شامل ہیں‘ یعنی البقرۃ‘ آل عمران‘ النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو مکی سورتیں اور دو ہی مدنی سورتیں شامل ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں اور سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ کی مکیات کا سلسلہ بہت طویل ہے جو گیارہویں پارے میں سورۂ یونس سے شروع ہو کر اٹھارہویں پارے تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدنی سورۃ آتی ہے‘ یعنی سورۃ النور‘ اور اس پر گروپ مکمل ہو جاتا ہے۔ پھر مکیات کا سلسلہ اٹھارہویں پارے میں سورۃ الفرقان سے شروع ہو کر بائیسویں پارے تک چلا گیا ہے‘ جس کے بعد سورۃ الاحزاب مدنی سورۃ ہے جس پر چوتھا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح سے مکیات اور مدنیات پر مشتمل قرآن حکیم کی سورتوں کے سات گروپ وجود میں آتے ہیں اور ان میں ایک معنوی تقسیم بھی نظر آتی ہے کہ ہر گروپ کا اپنا ایک مرکزی مضمون ہے جس کی تکمیل اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر کرتی ہیں۔

مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ

اب آیئے اس اصل موضوع کی طرف جس کے ضمن میں یہ ساری بات زیرِ بحث آئی ہے‘ اور وہ یہ کہ اس پہلو سے قرآن حکیم کی سورتوں کا جو چھٹا گروپ بنتا ہے اس میں سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ شامل ہیں۔ یہ گروپ بعض اعتبارات سے ایک خصوصی شان کا حامل ہے۔ اس کے آغاز میں سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکی سورتیں ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے جانتے ہیں کہ آہنگ (rhythm) اور روانی کے اعتبار سے قرآن حکیم میں ان سورتوں کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان سب کا مرکزی مضمون آخرت ہے اور اسی پر مختلف پہلوؤں سے ان سورتوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے ''عَروس القرآن'' کہا گیا ہے۔ الفاظ کا حسن اور تراکیب اور بندشوں کی بے مثل خوبصورتی اور اچھوتا پن ان سورتوں کا امتیازی اور مشترک وصف ہے۔

ان سات مکی سورتوں کے بعد اس گروپ میں دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ بلحاظِ

تعداد مدنی سورتوں کا یہ سب سے بڑا اور خوبصورت مجموعہ (constellation) ہے جس کی کوئی اور نظیر قرآن حکیم میں موجود نہیں۔ ویسے حجم کے اعتبار سے پہلے گروپ میں جو چار مدنی سورتیں یعنی البقرۃ‘ آل عمران‘ النساء اور المائدۃ شامل ہیں‘ وہ بہت طویل ہیں۔ لیکن بہرحال سورتوں کی تعداد وہاں چار ہی ہے‘ جبکہ یہاں دس مدنی سورتیں مسلسل وارد ہوئی ہیں۔ ستائیسویں پارے کی سورۃ الحدید سے ان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ‘ سورۃ التحریم پر ختم ہوتا ہے۔

زیرنظر مدنی سورتوں کے مشترک اوصاف

ان سورتوں میں کچھ چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور چونکہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب میں مکمل سورتوں کی سب سے بڑی تعداد اسی گروپ سے متعلق ہے‘ لہٰذا اس نصاب کے مضامین کی تفہیم کے لیے اس گروپ میں شامل سورتوں کے مشترک امور کو سمجھ لینا مفید ہوگا۔ اس سے پہلے اس گروپ کی دو سورتیں ہم پڑھ چکے ہیں۔ منتخب نصاب کے حصہ دوم میں‘ جو مباحثِ ایمان پر مشتمل ہے‘ ہم نے سورۃ التغابن کا مطالعہ کیا تھا جو اس گروپ میں شامل ہے۔ اسی طرح حصہ سوم میں اعمالِ صالحہ کی تفصیل کے ضمن میں عائلی زندگی اور اس سے متعلق اہم ہدایات پر مشتمل سورۃ التحریم کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں جو اس گروپ کی آخری سورۃ ہے۔ اب اس مرحلہ پر اسی گروپ کی دو مزید سورتوں یعنی سورۃ الجمعہ اور سورۃ الصّف کا مطالعہ ہم کرنے والے ہیں۔ مزید برآں اس منتخب نصاب کے آخری حصے میں ہمیں سورۃ الحدید کا مطالعہ کرنا ہے جس سے اس گروپ کی مدنی سورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر ان سورتوں کے بارے میں بعض بنیادی باتیں ذہن نشین کر لی جائیں‘ تاکہ ہر مرحلے پر ان کے تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ رہے۔

تمام خطاب اُمّتِ مسلمہ سے ہے!

پہلی چیز جو اِن دس سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے‘ یہ ہے کہ تقریباً ان سب کا زمانۂ نزول مدنی دَور کا نصفِ آخر ہے۔ یہ وہ دَور ہے جب مسلمانوں کا معاشرہ باقاعدہ وجود میں آ چکا تھا اور مسلمانوں کو غلبہ اور اقتدار بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو چکا تھا۔ گویا مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان سورتوں میں دوسری قدرِ مشترک آپ یہ دیکھیں گے کہ ان سورتوں میں خطاب کُل کا کُل مسلمانوں سے ہے‘ بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ۔ ان میں یہود و نصاریٰ سے یا مشرکینِ مکہ سے خطاب نہیں ملے گا‘ نہ بطرزِ دعوت و تبلیغ نہ بطورِ ملامت و زجر و توبیخ! خطاب کُل کا کُل اُمّتِ مسلمہ سے ہے‘ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کا اگر کہیں حوالہ آیا بھی ہے تو محض نشانِ عبرت کے طور پر۔ ان میں بھی نصاریٰ کی طرف reference ان سورتوں میں محض دو مقامات پر ہے‘ جبکہ اکثر سورتوں میں یہود کو بطورِ نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! جس مقام پر آج تم فائز کیے جا رہے ہو اس مقام پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ تم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل وہ تھے‘ انہیں تو راۃ عطا کی گئی تھی جس میں ہدایت بھی تھی اور قانون و شریعت بھی‘ تم سے پہلے وہ قوم اللہ کی نمائندہ اُمّت تھی جسے اڑھائی ہزار برس تک یہ مقامِ بلند حاصل رہا‘ لیکن جب انہوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کے ساتھ غداری کی تو وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے اور انہیں اس مقام سے معزول کر دیا گیا۔ اس سابقہ اُمّت میں کن کن راستوں سے گمراہیاں آئیں‘ کس کس پہلو سے ان میں اخلاقی‘ اعتقادی یا عملی اضمحلال پیدا ہوا‘ اس کو اپنے سامنے بطورِ نشانِ عبرت رکھو! اس لیے کہ اُمتوں کی تاریخ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ مَا أَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))(۱)

’’میری اُمت پر بھی وہ تمام حالات لازماً وارد ہوں گے جو اس سے پہلے بنی اسرائیل پر آئے ہیں‘ بالکل ایسے جیسے کہ ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے۔‘‘

دونوں اُمتوں کے حالات میں مشابہت کے بیان میں اس سے زیادہ بلیغ تمثیل ممکن

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الایمان عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء فی افتراق هذه الامة۔

نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے کو اس کی انتہا تک پہنچانے کے لیے یہ مثال بھی دی کہ اگر وہ (یعنی بنی اسرائیل) گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی ضرور گھسو گے‘ اور اگر ان میں سے کوئی بدبخت اور شقی ایسا پیدا ہوا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے بدکاری کی تھی تو تم میں سے بھی کوئی ایسا بدبخت پیدا ہو کر رہے گا۔ تو ان سورتوں میں درحقیقت اُمّت مسلمہ کے سامنے بطورِ نشانِ عبرت یہود اور نصاریٰ کے حالات بار بار لائے گئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھنا کہیں تم ان گمراہیوں کا شکار نہ ہو جانا!

اہم مضامین کے جامع خلاصے

ان سورتوں میں تیسری قدرِ مشترک یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے وہ اہم مضامین اور مباحث جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں بہت تفصیل سے آئے ہیں‘ ان کے گویا چھوٹے چھوٹے خلاصے نکال کر اس مقام پر جمع کر دیے گئے ہیں۔ ایمان کے مباحث مکی سورتوں میں بڑی لمبی بحثوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ توحید‘ معاد اور آخرت کے مباحث اور ان کے لیے دلائل‘ پھر ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات طویل سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں‘ ایمان اور اس کے ثمرات ولوازم کے بیان میں اٹھارہ آیات پر مشتمل سورۃ التغابن انتہائی جامع سورۃ ہے۔ کوئی جاننا چاہے کہ ایمان کیا ہے‘ اس کے لوازم کیا ہیں‘ اس کے نتائج اور مضمرات کیا ہیں اور اس کے فکری و عملی تقاضے کیا ہیں‘ تو سورۃ التغابن اس کے لیے کفایت کرے گی۔

اسی طرح نفاق کا مضمون طویل مدنی سورتوں (سورۃ النساء‘ سورۂ آل عمران اور سورۃ التوبۃ) میں بڑے طویل مباحث پر پھیلا ہوا ملے گا کہ نفاق کسے کہتے ہیں‘ اس کی حقیقت کیا ہے‘ اس کا نقطۂ آغاز کون سا ہے‘ اس مرض کی علامات کیا ہیں‘ اس کی ہلاکت خیزی کا عالم کیا ہے‘ اس سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہیں‘ اگر اس کی چھوت لگ جائے تو اس کا علاج کیا ہے‘ یہ تمام اُمور اِن سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن ان تمام مضامین کا ایک جامع خلاصہ اور لبِّ لباب ہمیں سورۃ المنافقون کی شکل میں عطا کر دیا گیا جو کُل گیارہ آیات پر مشتمل ہے اور اسی مجموعے میں شامل ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی سے متعلق یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ مفصل ہدایات اسی شعبۂ زندگی کے بارے میں دی گئی ہیں۔ گھر کا ادارہ انسان کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ اس ادارے کو کن خطوط پر استوار کیا جائے‘ بیویوں اور اولاد کے معاملے میں معتدل اور متوازن طرزِ عمل کون سا ہے‘ اگر طلاق کی نوبت آ جائے تو کن باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہو گا‘ ان موضوعات پر دو دو رکوعوں پر مشتمل دو انتہائی جامع سورتیں (سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم) بھی اسی گلدستے میں شامل ہیں۔

اس طرح یہ دس سورتیں گویا مختلف اعتبارات سے قرآن حکیم میں طویل بحثوں میں پھیلے ہوئے اہم مباحث کے خلاصوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ایک مقام پر یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور یہی درحقیقت سبب ہے اس کا کہ ان دس سورتوں میں سے چھ ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں‘ یعنی سورۃ الحدید‘ سورۃ الصّف‘ سورۃ الجمعۃ‘ سورۃ المنافقون‘ سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم۔

سرزنش اور ملامت کا اسلوب

ان سورتوں میں ایک اور قدرِ مشترک یا وصفِ مشترک یہ نظر آتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ سے خطاب میں بالعموم کچھ ملامت کا سا اور جھنجوڑنے کا سا انداز جھلکتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُمت کے بعض طبقات کے جذباتِ ایمانی اور جوشِ جہاد میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی‘ ان کا جذبۂ انفاق کچھ سرد پڑ رہا تھا اور اب انہیں جھنجوڑا جا رہا ہے‘ کچھ سرزنش کے انداز میں بھی اور کہیں کہیں ملامت اور زجر کے انداز میں بھی۔ یہ انداز ان تمام سورتوں میں مشترک ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دورانِ مطالعہ ہمارے سامنے آئیں گی۔ سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ ”اے اہل ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟“ ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ ”یہ چیز اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے کہ

تم کہو جو کرتے نہیں ہو۔'' اسی طرح سورۃ الجمعہ میں ڈانٹ کے سے انداز میں تنبیہہ کی گئی ہے کہ اے نبی! یہ کیا معاملہ ہے کہ آپؐ کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور مسلمان آپ کو چھوڑ کر چلے گئے! کیا خطبے اور نمازِ جمعہ کے مقابلے میں کاروبارِ دُنیوی انہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے؟ سورۃ الحدید میں یہی انداز ہے: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ.....﴾ (آیت ۱۶) ''کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد میں اور جو کچھ نازل ہوا ہے اللہ کی طرف سے اس کے سامنے.....؟'' سورۃ التحریم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک معاملے میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو سرزنش کی گئی ہے اور کم از کم ظاہر الفاظ کے اعتبار سے اس میں بڑی سختی موجود ہے۔ تو ان سورتوں میں یہ انداز بتکرار ملتا ہے۔

اس پیرایۂ بیان کا اصل سبب

اس ضمن میں یہ بات سمجھ لیجیے کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دَور تو وہ تھا جب کوئی شخص جان اور مال کی بازی کھیل کر ہی کلمۂ شہادت زبان پر لاتا تھا۔ مکی دَور میں یہی کیفیت تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کلمۂ شہادت کے زبان پر جاری ہوتے ہی ہر چہار طرف سے مخالفت کا طوفان اُمڈ پڑے گا' مصائب اور تکالیف کا سامنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کشمکش میں گھر بار سے تعلق توڑنا پڑے اور تمام پرانے تعلقات اور دوستیوں کو خیر باد کہنا پڑے۔ لہٰذا کلمۂ شہادت زبان پر لانے کا فیصلہ کوئی شخص اُسی وقت کرتا تھا جبکہ ایمان اس کے دل میں پورے طور پر جاگزیں اور راسخ ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ صورتِ حال تدریجاً بدل گئی۔ بالخصوص مدنی دَور کے آخری زمانے کا خیال کیجیے۔ نبی اکرم ﷺ کو فیصلہ کن اقتدار حاصل ہے' مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ ایک حکمران طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں' چنانچہ اب زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرنا نہ صرف آسان ہو گیا ہے بلکہ یہ کلمہ اب انسان کے جان و مال کے تحفظ کا ضامن بھی ہے۔ لہٰذا اب صورتِ حال وہ ہو گئی جس کا نقشہ سورۃ النصر میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾ تو یہ لوگ جو فوج در فوج اور جوق در جوق دینِ اسلام میں داخل ہو رہے تھے' ظاہر بات ہے کہ ان کے ایمان کی کیفیت وہ نہیں تھی جو سابقون الاوّلون کے ایمان کی تھی۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں آ چکی ہے۔ وہاں لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا گیا تھا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے' بس یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا۔ ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے' اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اب ظاہر بات ہے جب ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ اُمت میں شامل ہو گئے تو اُمت میں بحیثیتِ مجموعی جذباتِ ایمانی' جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کا اوسط کم ہو گیا۔ یہ وہ اضمحلال ہے جس پر اُسی وقت گرفت کی گئی۔ اس میں درحقیقت بعد کے اَدوار کے لیے' جبکہ اُمت میں بحیثیتِ مجموعی اضمحلال اور زوال پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونے والا تھا' پیشگی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ اور اس طرح آئندہ کے اَدوار میں یہ سورتیں مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی کو للکارنے اور اُن کے جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کو ازسرِ نو تازہ کرنے میں مہمیز کا کام دیں گی۔ ان کی تلاوت سے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہوگا کہ وہ اپنا جائزہ لیں' اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اگر ایمان کے اضمحلال کی متذکرہ بالا کیفیات انہیں اپنے باطن میں محسوس ہوں تو اس ضعف و اضمحلال کو دُور کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔

ہمارے لیے ان سورتوں کی خصوصی اہمیت

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دَور میں کہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' اُمتِ مسلمہ زوال و انحطاط کی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ مولانا حالیؔ نے درج ذیل دو اشعار میں جو انہوں نے اپنی مسدّس کی پیشانی پر درج کیے ہیں' اس کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا تھا: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اس دَور میں واقعہ یہ ہے کہ اگر ان سورتوں پر اُمت کی توجہات کو مرتکز کر دیا جائے‘ اِن کا فہم عام کر دیا جائے تو یہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کی ازسرِ نو باریابی اور ان کے اندر جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق پیدا کرنے میں اِن شاء اللہ العزیز انتہائی مفید اور ممد ثابت ہوں گی۔

المُسَبِّحات

آخری بات ان سورتوں کے بارے میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ ان دس سورتوں میں سے پانچ وہ ہیں کہ جن کا آغاز ’’سَبَّحَ لِلّٰہِ‘‘ یا ’’یُسَبِّحُ لِلّٰہِ‘‘ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس دس کے گلدستے میں یہ پانچ سورتیں ایک اضافی اور نرالی شان کی حامل ہیں۔ ان سورتوں کو مجموعی طور پر ’’المُسَبِّحات‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی وہ سورتیں جن کا آغاز تسبیح باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ ان میں سے تین وہ ہیں کہ جن میں آغاز میں ’’سَبَّحَ لِلّٰہِ‘‘ کے الفاظ وارد ہوئے۔ یعنی تسبیح کا ذکر فعل ماضی کی شکل میں کیا گیا ہے‘ جبکہ دو سورتوں کا آغاز ہوتا ہے ’’یُسَبِّحُ لِلّٰہِ‘‘ کے الفاظ سے۔ یہاں فعل مضارع لایا گیا ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ اس معاملے میں بھی ایک عجیب توازن نظر آتا ہے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی یہ لفظ ’’یُسَبِّحُ‘‘ شامل ہے۔ اس طرح گویا تین مرتبہ ’’سَبَّحَ‘‘ اور تین ہی مرتبہ ’’یُسَبِّحُ‘‘ کے الفاظ ان سورتوں میں وارد ہوئے ہیں۔ دورانِ مطالعہ آپ محسوس کریں گے کہ اُمّتِ مسلمہ کو جھنجوڑنے‘ مسلمانوں کو ان کے فرائضِ دینی سے آگاہ کرنے اور بالخصوص انہیں آمادۂ عمل کرنے میں ان ’’مُسبِّحات‘‘ کی تأثیر دوسری سورتوں سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ان پانچ ’’مُسبِّحات‘‘ میں سے چار اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی سورۃ‘ سورۃ الحدید ہے۔ وہ یوں سمجھئے کہ ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ عروج ہوگی۔ گویا اس کا نقطۂ آغاز اگر سورۃ العصر ہے تو اس کی چوٹی (climax) سورۃ الحدید ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ شجرِ ہدایت کا بیج اگر سورۃ العصر ہے تو اس کا پھل ہے سورۃ الحدید‘ جس پر ہمارا یہ منتخب نصاب اِن شاء اللہ تکمیل پذیر ہوگا۔ یہ چند باتیں اگر ذہن نشین کر لی جائیں تو امید ہے کہ قرآن مجید سے ایک عمومی تعارف میں بھی ممدّ و معاون ہوں گی اور خاص طور پر ان سورتوں کی اہمیت کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے گی۔ اِن شاء اللہ!

چند تمہیدی مباحث

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا براہِ راست مطالعہ کرنے سے قبل قرآن حکیم کی سورتوں کے بارے میں تعارفی و تمہیدی نوعیت کی دو مزید باتوں کی جانب توجہ کرنا مفید رہے گا۔ اجمالاً ان امور کی جانب اشارات پچھلے اسباق میں بھی کیے جا چکے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے اسی طرح قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک عمود یا axis ہوتا ہے‘ جسے ایک ایسے دھاگے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں موتی پروئے گئے ہوں اور ان موتیوں کو ہار کی شکل دی گئی ہو۔

قرآن حکیم کی ہر آیت اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک حسین موتی ہے۔ لیکن جب اسے ایک سلسلۂ کلام کی لڑی میں پرو دیا جاتا ہے‘ ایک مرکزی مضمون کے ساتھ اس کا ربط قائم ہوتا ہے تو اس کے حسن میں ایک نئی شان پیدا ہوتی ہے اور اس ربط باہم سے علم و حکمت کے نئے نئے پہلو آشکارا ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی ہر سورۃ پر غور کرنے کے لیے اس سورۃ کے مرکزی مضمون اور عمود کا تعین ضروری ہے۔ پھر ہر آیت پر اپنی جگہ غور کرنے کے بعد اس مرکزی مضمون کے ساتھ ان آیات کے ربط کو تلاش کرنا تدبّرِ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ اسلوب نظر آتا ہے کہ کسی ایک مضمون کو جس کے دو رُخ یا دو پہلو

ہوں، کسی ایک ہی سورۃ میں بیان کرنے کی بجائے بالعموم دو سورتوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے اور وہ دو سورتیں گویا ایک جوڑے (pair) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس مضمون کے ایک پہلو پر گفتگو اُس جوڑے میں شامل ایک سورۃ میں اور دوسرے پر بحث دوسری سورۃ میں ہوتی ہے۔ اور جیسے کہ محاورتاً کہا جاتا ہے کہ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور ان کے اجتماع سے تصویر مکمل ہوتی ہے، اسی طرح دونوں سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

اس کی ایک نمایاں مثال ''مُعوَّذتَین'' کی ہے جو قرآن حکیم کی آخری دو سورتیں ہیں۔ ان کا مضمون ایک ہی ہے، یعنی ''تعوّذ''۔ ان چیزوں کو کہ جن سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے، دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک وہ آفات ہیں جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو انسان کے اپنے باطن سے اُبھرتی ہیں۔ پہلی قسم کی آفات سے سورۃ الفلق میں اللہ کی پناہ حاصل کرنے کا ذکر ہے اور دوسری نوع کی آفات سے سورۃ الناس میں۔ اس طرح سے ''مُعوَّذتَین'' کی شکل میں قرآن حکیم کی سورتوں کا ایک حسین وجمیل جوڑا وجود میں آ گیا۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃ المزّمّل اور سورۃ المدّثّر کا ہے۔ ان دونوں سورتوں کے ناموں میں بھی لفظی مشابہت موجود ہے اور مضامین کے اعتبار سے بھی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ ایک میں نبی اکرم ﷺ کو قیام اللیل کی شکل میں ذاتی ریاضت کا حکم دیا جا رہا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ ''اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو مگر تھوڑا سا''۔ یہ آپؐ کی ذاتی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝﴾ ''یقیناً ہم آپ پر عنقریب بڑی بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔ اس کے لیے آپؐ کو ذاتی تربیت کے اس مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ اور دوسری سورۃ میں اس مشن کے لیے کھڑے ہونے کا ذکر ہے کہ جس کے لیے آپ ﷺ کو بھیجا گیا تھا اور جس کے لیے یہ ساری تیاری درکار تھی۔ فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ ''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور خبردار کیجیے! اور اپنے ربّ کی بڑائی (کا اعلان) کیجیے!'' یعنی اب اپنے مشن اور مقصد کی تکمیل کے لیے کھڑے ہو جایئے، اپنی جِد وجہد کا آغاز کیجیے، اور اللہ کی کبریائی کا اعلان کیجیے! چنانچہ یہ دونوں سورتیں مل کر ایک حسین وجمیل جوڑے کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

یہ دو مثالیں ان سورتوں سے متعلق تھیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بڑی آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ مثلاً اٹھائیسویں پارے کے آخر میں دو سورتیں سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق ایک انتہائی خوبصورت جوڑے کی شکل میں ہیں۔ یہ دونوں سورتیں عائلی زندگی کے دو مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلقہ مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ایک پہلو شوہر اور بیوی کے مابین عدم موافقت سے متعلق ہے جس کی انتہا طلاق ہے۔ اور دوسرے کا تعلق شوہر اور بیوی کے مابین محبت والفت سے ہے، جو اگرچہ مطلوب اور پسندیدہ ہے، لیکن اگر یہ معاملہ حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ اس حد تک کیا جانے لگے کہ حدود اللہ ٹوٹنے لگیں تو یہ دوسری انتہا ہے۔ سورۃ الطلاق میں ایک انتہا سے بحث ہوئی اور سورۃ التحریم میں دوسری انتہا زیرِ بحث آئی۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن کا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ ایمانِ حقیقی اور اس کے ثمرات ومضمرات کے موضوع پر سورۃ التغابن قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ اگرچہ قانونی سطح پر ایمان کے مقابل کا لفظ ''کفر'' ہے، لیکن حقیقی اعتبار سے ایمان کے مقابل کا لفظ ''نفاق'' ہے۔ نفاق دراصل فقدانِ ایمان کی باطنی کیفیت کا نام ہے۔ چنانچہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل جڑی ہوئی سورۃ المنافقون موجود ہے جو نفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ نفاق کے اسباب اور اس کے نقطۂ آغاز سے لے کر اس کے انجام اور اس کے علاج تک تمام اہم مباحث اس ایک چھوٹی سی سورۃ میں جمع ہیں۔ سورۃ التغابن اور سورۃ المنافقون دونوں کو مصحف میں یکجا کر دیا گیا اور اس طرح ایک

مضمون کی تکمیل ہوگئی۔

بعثتِ نبویؐ کے دو اہم پہلو

باہم جوڑا ہونے کی یہ نسبت سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ میں بھی بہت نمایاں ہے۔ چونکہ ان دو سورتوں میں بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو رُخ زیرِ بحث آئے ہیں' لہٰذا میرا احساس یہ ہے کہ ان پر غور وفکر کرنے والا ہر شخص اپنے باطن میں ان سورتوں کے ساتھ قلبی اور ذہنی مناسبت کی ایک عجیب اور نرالی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ایک سورت یعنی سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا ہے! یہ موضوع اپنی جگہ نہایت اہم ہے' اس لیے کہ کسی بھی شخص کے کارنامۂ حیات کو assess کرنے (جانچنے) کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اس کا ہدف کیا تھا' وہ کیا کرنے چلا تھا اور اس کی منزلِ مقصود کون سی تھی۔ اس پہلو سے سیرتِ محمدیؐ کے مطالعے کے لیے واقعتاً یہ سورۂ مبارکہ اور بالخصوص اس کی مرکزی آیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے' کہ یہ سمجھا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا اور آپؐ کا فرضِ منصبی کیا تھا! یہ ہے مرکزی مضمون سورۃ الصّف کا۔ چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ اس سورۂ مبارکہ میں تفصیل سے یہ مباحث آئے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس جدّ وجہد میں رسولؐ کا ہاتھ بٹائیں' رسولؐ کے دست و بازو بنیں' آپؐ کے مشن کی تکمیل میں اپنی جان اور مال' اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف کر دیں' اور اگر ضرورت پڑے اور وقت آئے تو اس راہ میں اپنی جان بھی نچھاور کر دیں۔ یہ گویا ان کے ایمان کی صداقت کی دلیل ہوگی۔ اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ اس سورۃ الصّف میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا مضمون اپنی منطقی انتہا اور اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے اس چوتھے حصے میں رکھا گیا ہے جو ''تواصی بالحق'' کی تشریحات پر مشتمل ہے اور جس کا جامع عنوان ہے ''جہاد فی سبیل اللہ''۔

ذہن میں رہے کہ اس منتخب نصاب میں جہاد کی بحث کا آغاز سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ سے ہوا تھا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾۔ پھر آیت ۱۵ میں ایمانِ حقیقی کی تعریف (definition) اِن الفاظ میں آئی: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''حقیقت میں تو مؤمن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لائے پھر وہ شک میں نہیں پڑے' اور انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا''۔ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یا اس کی ابتدائی منزل کا ذکر سورۃ الحج کی آخری آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ یعنی دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرنا' لوگوں پر اِتمامِ حجت کرنا یا بالفاظِ دیگر ''شہادت علی الناس'' کا فریضہ ادا کرنا جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف ہے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل' اس کی غایتِ قصویٰ یا اس کا ہدفِ آخریں ہے اللہ کے دین کا غلبہ۔ اور یہ ہے وہ اہم مضمون جو اس سورۃ الصّف میں ہمارے سامنے آئے گا۔

بعثتِ نبویؐ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ اساسی منہجِ عمل اور وہ بنیادی طریق کار کون سا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کیا اور اپنے اس مشن کی تکمیل کی جس کا تعین سورۃ الصّف میں کیا گیا ہے۔ یہ ہے سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون۔ اس پہلو سے سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعے میں ان دونوں سورتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سورتوں نے مل کر گویا ایک مضمون کی تکمیل کر دی کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا' اور اس کے لیے آپؐ کا اساسی طریق کار اور بنیادی منہجِ عمل کون سا تھا!

مقصد کا تعین اور صحیح منہجِ عمل کی تعیین

یہاں ایک بات کی جانب توجہ دلانا غیر مفید نہ ہوگا جو بڑی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر اُس شخص کو جو دین کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا کچھ بھی احساس وشعور رکھتا

ہو اور اپنے ان فرائض کی ادائیگی پر کمر بستہ ہو‘ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دین کی سربلندی کی جدّ و جہد میں یہ دونوں باتیں بہت اہم ہیں: (i) مقصد کا تعین اور (ii) اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح راہ کا تعین۔ دونوں انتہائی ضروری ہیں۔ اگر مقصد کا تعین صحیح نہیں ہے‘ ہدف غلط معین ہو گیا ہے‘ یا بلامقصد کسی ایک دائرے (circle) میں حرکت جاری ہے تو لاکھ محنت اور کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا‘ خواہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ گھروں سے نکلیں اور چالیس چالیس دن بلکہ اس سے بھی زیادہ وقت دین کی محنت میں صرف کریں۔ اگر یہ ساری محنت بغیر ہدف کے ہو رہی ہے تو غلبۂ دین کی راہ میں کوئی مؤثر پیش رفت اس ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ منزل اور ہدف کا تعین بہت ضروری ہے —— لیکن ہدف کے تعین کے ساتھ ہی اس طے شدہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے صحیح منہجِ عمل اور طریق کار کا تعین بھی از حد ضروری ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ منزل کے صحیح تعین کے باوجود انسان کسی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ صحیح منہجِ عمل اگر سامنے نہ ہو تو منزل تک پہنچنے کی جلدی میں بعض اوقات انسان کسی راہِ قصیر (short cut) کو آزمانے کی غلطی کر بیٹھتا ہے‘ لیکن پھر وہ شارٹ کٹ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ پھر تمام محنتوں‘ کوششوں اور قربانیوں کے باوجود منزل دُور سے دُور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ صحیح منہجِ عمل کو ترک کرنے کا یہ نتیجہ نکل کر رہتا ہے۔

یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کے سمجھ لینے کی ہے کہ ہر مقصد اور ہر ہدف کے حصول کے لیے ہر طریق کار مفید نہیں ہوتا۔ ہر مقصد کے حصول کا اپنا ایک معین طریق کار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کا خواہش مند ہے تو اسے ایک خاص منہجِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اسے اپنے معاشرے میں طبقاتی شعور پیدا کرنا ہوگا اور اس طبقاتی شعور کو اُجاگر کر کے طبقاتی تصادم کو جنم دینا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی نیک دل انسان تصادم کو ناپسند کرتا ہو اور اس سے گریز چاہتا ہو تو ظاہر بات ہے کہ وہ اشتراکی انقلاب کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اس لیے کہ اس انقلاب کا راستہ اسی وادی میں سے ہو کر گزرتا ہے۔

اسی طرح یہ بات جان لیجیے کہ دین کی اقامت اور اس کا غلبہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہیں۔ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے گی: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ.....﴾۔ اس ضمن میں اگر کسی کو اشتباہ ہے‘ اور نیک نیتی کے ساتھ اشتباہ ہے تو وہ اللہ کے ہاں تو عذر پیش کر سکے گا‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پھر قرآن مجید اور اس کے فہم سے اسے کوئی حصّہ حاصل نہیں!

دین کو دنیا میں ایک عملی اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے قائم اور برپا کرنا بعثتِ محمدیؐ کا بنیادی مقصد ہے۔ اسی کے لیے محنت‘ اسی کے لیے جدّ و جہد‘ اسی کے لیے کوشش‘ اسی کے لیے جینا‘ اسی کے لیے مرنا‘ اسی میں مال اور جان کا کھپانا بندۂ مؤمن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی کا اپنا ایک طریق اور نہج معین ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ دنیا میں بعض دوسری تحریکیں کسی اور طریقے پر عمل پیرا ہو کر کامیاب ہو گئیں‘ کوئی وقتی سا نعرہ کسی تحریک کے لیے مفید ثابت ہو گیا یا کسی نے کوئی شارٹ کٹ اختیار کیا اور لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہو گیا‘ اور اس قسم کی چیزوں سے متأثر ہو کر ہم بھی ایسا ہی کوئی طریق کار غلبۂ دین کی جدوجہد میں اختیار کریں تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ تمام تر خلوص اور اخلاص کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکے گا —— اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اساسی منہجِ عمل وہ ہے جو سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت میں نہایت دوٹوک الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آیت ۲)

مقصدِ بعثت کا مضمون تین مرتبہ دہرایا گیا

یہاں یہ عجیب بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں وہ آیت جس میں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا بیان ہے‘ تین مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ دو مرتبہ اِس

شان کے ساتھ آئی ہے کہ اس میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ یہی الفاظ سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳ میں وارد ہوئے ہیں اور بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ آیت سورۃ الصّف کے وسط میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں آیت ۲۸ کا مرکزی حصہ بھی انہی الفاظ پر مشتمل ہے‘ یعنی: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾—— یہاں تک الفاظ بالکل وہی ہیں جو سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں وارد ہوئے ہیں‘ البتہ آیت کے آخری حصے میں یہاں ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کی بجائے ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

اساسی منہجِ عمل کا ذکر چار مقامات پر!

اب آیئے سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کی طرف جو نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے بنیادی طریق کار یا بالفاظِ دیگر انقلابِ محمدیؐ کے اساسی منہاج کو معیّن کر رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت قرآن حکیم میں تین مرتبہ وارد ہوئی تھی تو یہ آیت ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ اوّلاً یہ آیت سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع میں وارد ہوئی ہے‘ جہاں نقشہ کھینچا گیا ہے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا جبکہ وہ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے: ﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ﴾ اُس وقت جو دعائیں ان کی زبانوں پر تھیں ان میں ایک دعا تو یہ تھی کہ اے پروردگار! ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذُرّیت اور اولاد میں سے ایک اُمتِ مسلمہ برپا کیجیو! اور پھر ان کی آخری اور نہایت اہم دعا یہ نقل ہوئی کہ:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ﴾ (آیت ۱۲۹)

’’اے ہمارے پروردگار! ان میں ایک رسول مبعوث کیجیو انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔‘‘

یہ ہے درحقیقت بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا۔ پھر تین رکوعوں کے بعد سورۃ البقرۃ ہی میں اٹھارہویں رکوع کے اختتام پر اعلان ہوتا ہے:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.....﴾ (آیت ۱۵۱)

’’جیسا کہ ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے اندر ایک رسول تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے.....‘‘

اعلان کر دیا گیا کہ محمد ﷺ کی بعثت دراصل اُسی دعاءِ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا ظہور ہے۔ سورۂ آل عمران میں اس مضمون کی پھر تکرار ہوئی ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آیت ۱۶۴)

’’اللہ نے احسان کیا ہے اہل ایمان پر کہ اس نے ان میں ایک رسول مبعوث کیا انہی میں کا‘ جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔‘‘

ان تین مقامات کے بعد چوتھی بار یہی مضمون یہاں سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں‘ جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے‘ وارد ہوا ہے۔ اور اس طرح ان دونوں سورتوں کے باہم مجتمع ہونے سے وہ حسین وجمیل جوڑا وجود میں آیا جو ایک طرف بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقصد کو معین کر رہا ہے اور دوسری طرف اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح منہجِ عمل اور بنیادی طریق کار کو معین کر رہا ہے۔

اب ہم ان سورتوں کے مطالعے کا آغاز کرتے ہیں اور اس کے لیے ہمیں اپنے سابقہ معمول سے قدرے مختلف طریق کار اختیار کرنا ہے‘ اس لیے کہ ان سورتوں کا درس

اگر اس نہج پر ہو کہ پہلے ایک ایک آیت پر توجہات کو مرتکز کیا جائے اور پھر ان میں شامل ایک ایک لفظ کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی جائے تو اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ بہت طول اختیار کر جائے گا۔ ان دونوں سورتوں کے درس میں یہ طریق ملحوظ رہے گا کہ اوّلاً ہر سورۃ کی مرکزی آیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ وہ اصل سِرا یا ڈور ہاتھ میں آ جائے جس میں یہ موتی پروئے ہوئے ہیں۔ اس مرکزی آیت کو سمجھنے کے بعد پھر مختلف آیات کے ساتھ اس مرکزی مضمون کے ربط و تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے‘ تاکہ بحیثیتِ مجموعی سورۃ کا اصل مفہوم واضح ہو جائے۔ اسی طریقے سے سورۃ الصّف کا مطالعہ ہوگا اور اسی نہج پر‘ اِن شاء اللہ العزیز‘ سورۃ الجمعہ کا مطالعہ ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں

اس سے پہلے کہ ہم سورۃ الصّف کی مرکزی آیت پر غور شروع کریں‘ ایک بنیادی حقیقت کی طرف توجہ کر لینا مفید ہوگا۔ ہماری اس گفتگو میں بار بار نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا حوالہ آیا ہے۔ تو یہ جان لینا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ آپؐ بھی یقیناً دوسرے انبیاء کی طرح اللہ کے ایک نبی ہیں‘ لیکن آپؐ صرف نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ آپ ﷺ کو بھی دیگر رسولوں کی طرح رسالت سے سرفراز کیا گیا ہے‘ لیکن آپؐ صرف ایک رسول نہیں‘ آخر المرسلین بھی ہیں۔ گویا آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو تمام نبیوں اور رسولوں کے پیش نظر تھیں‘ اور اضافی طور پر آپؐ کے مقصدِ بعثت کی ایک خصوصی اور امتیازی شان ختم نبوت اور ختم رسالت کے حوالے سے ہے جس میں آپؐ تمام انبیاء و رُسل میں ممتاز ہیں۔

ختم نبوت اور ختم رسالت کے ایک پہلو سے تو ہم سب خوب اچھی طرح واقف ہیں‘ یعنی یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا‘ نہ کوئی صاحبِ شریعت نبی اور نہ کوئی بغیرِ شریعت نبی‘ نہ کوئی ظلّی نبی اور نہ ہی کوئی بروزی نبی! آپؐ پر ہر نوع کی نبوت و رسالت ختم ہوگئی‘ لیکن ختم نبوت و رسالت کا دوسرا اور اہم تر پہلو یہ ہے کہ آپؐ پر نبوت و رسالت کا محض اختتام ہی نہیں ہوا‘ اتمام بھی ہوا ہے‘ تکمیل بھی ہوئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا یہ وہ امتیازی پہلو ہے جو بالعموم ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ آپ ﷺ کا بنیادی مقصدِ بعثت یقیناً وہی ہے جو تمام انبیاء اور تمام رسولوں کا تھا‘ لیکن آپؐ کے مقصدِ بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی شان بھی ہے جس کی حیثیت ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کے عکس اور پرتو کی ہے اور اس میں کوئی دوسرا نبی اور رسول آپؐ کے ساتھ شریک نہیں! سورۃ الصّف میں درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے اور اسی کے حوالے سے جہاد و قتال کا موضوع تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے اس بنیادی مقصدِ بعثت کا تعلق ہے جو تمام انبیاء اور رُسل کا مشترکہ مقصدِ بعثت رہا ہے‘ اس کے بارے میں یہاں کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حوالے سے جو فرائضِ نبوت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام ادا کرتے رہے وہی فرائض آپ ﷺ کو بھی تفویض ہوئے۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا کہ:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ (الکھف:۵۶)

’’اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر مبشر اور نذیر بنا کر۔‘‘

بعثتِ انبیاء و رُسل کے ضمن میں یہ اللہ کا ایک عمومی قاعدہ ہے۔ چنانچہ یہی بات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی قرآن میں وارد ہوئی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾﴾ (بنی اسراء یل)

’’اور (اے نبی!) ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔‘‘

اسی طرح ہر نبی اپنی جگہ ہدایت و رہنمائی کا ایک روشن چراغ ہے‘ ہر نبی معلّم ہے‘ ہر نبی مربی اور مزکی ہے‘ ہر نبی داعی ہے‘ مبلّغ ہے اور مذکر ہے۔ یہ ساری حیثیتیں جملہ انبیاءِ کرام علیہم السلام میں مشترک ہیں۔ چنانچہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ میں بھی یہ تمام حیثیتیں جمع ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک حیثیت کے اعتبار سے بھی نبی اکرم ﷺ ایک امتیازی شان

کے حامل ہیں ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!'' تاہم یہ وہ مشترک اوصاف اور حیثیتیں ہیں جو تمام انبیاء و رُسل کو حاصل تھیں۔ سورۃ الاحزاب کی یہ مشہور آیت تمام قارئین کو یاد ہوگی:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾﴾

''اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کو بھیجا ہے شاہد (گواہ) بنا کر، مبشر بنا کر اور مُنذر بنا کر (یعنی سیدھی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے بشارت دینے والا بنا کر اور فکری و عملی کج روی اختیار کرنے والوں کے لیے خبردار کرنے والا بنا کر)۔ اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے حکم سے اور (ہدایت کا) ایک روشن چراغ بنا کر۔''

یہ تمام حیثیتیں مشترک ہیں نبی اکرم ﷺ اور جملہ انبیاء و رُسل میں۔ جہاں تک اس بنیادی مقصدِ بعثت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں قرآن حکیم کی سب سے جامع اصطلاح ''شہادت علی الناس'' کی ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحج کی آخری آیت کے درس میں ''شہادت علی الناس'' کا موضوع تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ اور وہیں یہ توجہ بھی دلائی گئی ہے کہ یہ مضمون ایک عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ البقرۃ میں بھی جوں کا توں موجود ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳)

اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے یہ بات بڑی وضاحت سے ہمارے سامنے آئی تھی کہ ختم نبوت و رسالت کے بعد ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ داری اب اُمتِ مسلمہ کے کاندھے پر آ چکی ہے۔ اس کے لیے سعی و جُہد، اس کے لیے ایثار و قربانی، اس کے لیے اوقات اور صلاحیتیں کھپانا اور مال و جان کا لگانا درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ ہے۔ یہ مقصدِ اوّلین ہے جہاد فی سبیل اللہ کا! —— اور جہاں تک تعلق ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی اور تکمیلی شان کا، اس کے اعتبار سے بھی ایک فرضِ منصبی اب تا قیامِ قیامت اُمّتِ مسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل اب ایک ذمہ داری کے طور پر منتقل ہو چکی ہے آپؐ کے ماننے والوں پر، جو اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ کی شفاعت کا حق دار سمجھتے اور آپؐ سے اپنی نسبت پر فخر کرتے ہیں۔ یقیناً آپ ﷺ کی اُمت میں سے ہونا مسلمانوں کے لیے موجبِ صد افتخار ہے، لیکن جہاں یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے وہاں اتنی ہی بڑی ذمہ داری کا معاملہ بھی اس سے وابستہ ہے ع

''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!''

اس پہلو سے سورۃ الصّف کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے اور اس کے ضمن میں کیا عملی ذمہ داریاں ہیں جو آپؐ کے ماننے والوں پر، آپؐ کی اُمت پر عائد ہوتی ہیں!

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تعیین

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

سورۃ الصّف کی یہ آیت' جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' باعتبارِ مضمون اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا عمود معین ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا بڑا اور مرکزی حصہ جوں کا توں قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اس تکرار اور اعادے سے دراصل اس مضمون کی اہمیت کی جانب راہنمائی ہوتی ہے۔ یقیناً قرآن مجید میں بعض الفاظ یا مضامین کا بار بار آنا ان کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''اِزَالَةُ الْخِفَاءِ عَنْ خِلَافَةِ الْخُلَفَاءِ'' میں قرآن کریم کی اہم ترین آیات میں سے شمار کیا ہے۔ بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے تعین میں اس آیۂ مبارکہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اسے ''اسلامی انقلاب'' کے لیے عنوان قرار دیا تھا۔ بعض حضرات نے یہ بات نقل کی ہے' اگرچہ میں خود اس کی تصدیق نہیں کر پایا' کہ حضرت شاہ ولی اللہد ہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کے لیے بمنزلۂ عمود قرار دیا ہے۔ اور اس میں تو ہرگز شک نہیں کہ سیرتِ محمدیؐ کو سمجھنے اور نبی اکرم ﷺ کے کارنامۂ حیات کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لیے کہ آپؐ کی عملی جدوجہد کن کن مراحل سے ہو کر گزری' کہاں سے سفر شروع ہوا اور کہاں پر ختم ہوا' اس آیت کا سمجھنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کو سمجھنے میں لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو اگر صرف دوسرے انبیاء پر قیاس کیا جائے تو بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

مستشرقین کی کوتاہ فہمی

مستشرقین نے بالخصوص اس معاملے میں بڑا دھوکہ کھایا ہے۔ ان کے سامنے نبوت و رسالت کے آئیڈیل حضرت مسیح یا حضرت یحییٰ علیہما السلام ہیں اور ان کی زندگی میں کسی قتال یا جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔ چنانچہ مغربی مفکرین اور مستشرقین کو جنگ و قتال کا معاملہ منصبِ رسالت سے بڑا ہی متصادم نظر آتا ہے۔ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مؤرخ ٹائن بی کا یہ جملہ بہت مشہور ہے:

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman."

ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا جو نقشہ مکی دَور میں سامنے آتا ہے صرف وہی نبوت و رسالت سے مطابقت رکھتا ہے' جبکہ وہاں سے آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی۔ گویا ان کے خیال میں بحیثیتِ نبی اور رسول آپ ﷺ ناکام ہو گئے۔ (معاذ اللہ)۔ اس کے برعکس مدنی دَور میں جو نقشہ ان کے سامنے آتا ہے اس میں انہیں آنحضور ﷺ ایک حکمران' ایک مدبّر' ایک سیاست دان اور ایک سپہ سالار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں اور اس پہلو سے وہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ کامیابی کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کون اندھا ہوگا کہ جس کی نگاہیں آپؐ کی عظمت کے احساس سے جھک نہ جائیں کہ کامیابی گویا اپنے آخری اور تکمیلی درجے میں محمد ﷺ کے قدم چومتی نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے یہ گرہ لگا دی کہ یہ کامیابی بحیثیتِ مدبّر (statesman) تھی' بحیثیتِ نبی نہیں تھی۔ اسی مغالطے کو پیدا کرنے کے لیے سر منٹگمری واٹ نے سیرتِ نبویؐ پر جو کتاب لکھی اسے دو حصوں میں تقسیم کیا: ''Mohammad at Mecca'' اور ''Mohammad at Madina'' اور اس طرح اس نے مکی اور مدنی دَور کے ظاہری تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ نبی اکرم ﷺ کی تعریف میں اس نے کہیں بخل سے کام نہیں لیا' بلکہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو نسلِ آدم کے عظیم ترین افراد میں شمار کیا ہے۔ آپؐ کے تدبّر' آپؐ کی

فراست‘ آپؐ کی معاملہ فہمی‘ آپؐ کی پیش بینی‘ آپؐ کی دُور اندیشی‘ ان تمام اعتبارات سے اس نے آپؐ کی صلاحیتوں کا لوہا مانا ہے اور آپؐ کی تعریف میں آخری حد تک چلا گیا ہے۔ لیکن اس مٹھاس کے اندر اس نے بڑے لطیف پیرائے میں ایک زہر بھی شامل کر دیا ہے۔ وہ زہر یہی ہے کہ وہ لوگ یہ تصور دینا چاہتے ہیں کہ آپؐ کی یہ تمام کامیابیاں ایک سیاست دان اور ایک مدبّر کی حیثیت سے تھیں‘ نبی کی حیثیت سے نہیں تھیں۔ یہ سارا مغالطہ اسی بنیاد پر ہے کہ ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کے لازمی اور منطقی تقاضے کو نہیں سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کے صحیح فہم کے لیے یہ آیۂ کریمہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

رسولِ کامل ﷺ

اس تمہید کے بعد اب ذرا اس آیۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ﴾ ’’وہی ہے وہ‘‘۔ یہاں اشارہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف۔ اس لیے کہ سورۃ الصّف میں جو آیت اس آیت سے متصلاً قبل وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ: ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ’’یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں‘ اور اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا‘ خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو‘‘۔ اس پہلو سے جب ’’هُوَ‘‘ سے اگلی آیت شروع ہوئی تو معین ہو گیا کہ اس سے مراد ہے ذاتِ باری تعالیٰ۔

آگے چلئے: ﴿اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ’’(وہی ہے اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ذکر ہے محمد ﷺ کا۔ عربی زبان میں اَرْسَلَ‘ یُرْسِلُ‘ اِرْسَالًا کا مفہوم ہے بھیجنا۔ یعنی کسی کو ایلچی بنا کر‘ سفیر بنا کر یا پیغمبر بنا کر بھیجنا۔ یہاں آنحضور ﷺ کے حوالے سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مختلف انبیاء و رُسل (علیہم السلام) کے اَسماء کے ساتھ ان کی بعض خصوصی نسبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ صفی اللہ کے الفاظ معروف ہیں۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو نجیّ اللہ‘ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ‘ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اس فہرست میں حضرت محمد ﷺ کے نام کے ساتھ ’’رسول اللہ‘‘ ہی کے الفاظ معروف و مشہور ہیں۔ غور کرنے پر یہ حقیقت کھلے گی کہ اگرچہ نوح علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے‘ موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے‘ عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے‘ لیکن اس لفظ ’’رسول‘‘ کا مصداقِ کامل اور مصداقِ اَتم ہیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔ رسالت کا ادارہ تکمیل کو پہنچا ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں۔ گویا آپؐ کا امتیازی لقب یا امتیازی شان ہی یہ ہے کہ آپ ’’رسول اللہ‘‘ ہیں۔ سورۃ الفتح میں آپ ﷺ کی اسی نسبت کو نمایاں کیا گیا ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ.....﴾ (آیت ۲۹) ’’محمد اللہ کے رسول ہیں‘ اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت ہیں‘ آپس میں رحم دل ہیں.....‘‘ اس میں گویا اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ موجود ہے جس کی جانب پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ رسالت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں۔

’’اَلْهُدٰی‘‘ اور ’’دِیْنِ الْحَقِّ‘‘

اب آگے بڑھیے: ﴿بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾ ’’الہدیٰ اور دینِ حق دے کر‘‘۔ حرفِ ’’ب‘‘ عربی میں کسی چیز کی معیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا ہے: (۱) الھدیٰ اور (۲) دین الحق۔ الہدیٰ سے مراد ہے ہدایتِ کاملہ‘ وہ کتابِ ہدایت کہ جس نے ہدایت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہو‘ سمیٹ لیا ہو‘ سمو لیا ہو۔ اس کی تعیین کے ضمن میں اگر قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس سے مراد خود قرآن ہے۔ اس لیے کہ اسی قرآن کے لیے سورۃ البقرۃ کے بالکل آغاز میں ’’هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی کو ’’هُدًى لِّلنَّاسِ‘‘ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی قرآن ہے جس کے بارے میں سورۂ بنی اسراءیل میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ

﴿يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ.....﴾ (آیت ۹) ''درحقیقت یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے.....'' تو معلوم ہوا کہ ''الہدیٰ'' سے مراد ہے قرآن حکیم۔ دوسری چیز جسے آپ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا' وہ ''دینِ حق'' ہے۔ یہاں ''دین الحق'' عربی نحو کے اعتبار سے مرکب اضافی کی صورت میں ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ہوں گے ''حق کا دین'' تاہم عربی میں بعض اوقات مرکبِ توصیفی مرکبِ اضافی کی شکل میں آ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ ہوگا: حق دین یا سچا دین۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ اسے اگر حق کا دین قرار دیں تو بھی درست ہے' کیونکہ قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر اللہ کو ''الحَقّ'' کہا گیا ہے۔ جیسے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ (الحج:۶) ''یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے''۔ مجسم حق اور کامل حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ گویا ''حق کا دین'' کے معنی ہوں گے اللہ کا دین۔ اور اگر اسے مرکبِ توصیفی مان کر ''سچا دین'' ترجمہ کیا جائے تو بھی بات وہیں جا پہنچے گی' اس لیے کہ سچا ترین دین تو اللہ ہی کا ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے دین سے کیا مراد ہے؟ لفظ دین پر غور کیجیے! یہ لفظ اس سے پہلے سورۃ الفاتحہ کے درس میں ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے ضمن میں زیر بحث آ چکا ہے۔ وہاں پر عرض کیا گیا تھا کہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جزا و سزا اور بدلہ۔ مشہور مصرعہ ہے: ع دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا کہ جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ معاملہ کیا تھا ویسا ہی ہم نے ان سے کر دیا۔ یعنی ہم نے ان کے عمل کا انہیں پورا پورا بدلہ دے دیا ہے۔ اسی طرح ایک معروف کہاوت ہے: كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے''۔ عربی زبان میں ''دَيْنٌ'' کہتے ہیں قرض کو' کہ وہ لوٹ کر آتا ہے۔ جس طرح کسی عمل کی جزا عمل کرنے والے کی طرف لوٹ کر آتی ہے اسی طرح ''دَيْن'' (قرض) دینے والے کو واپس ملتا ہے۔ تو لفظ دِین کے اصل لغوی معنی بدلے اور جزا و سزا کے ہیں۔ لیکن قرآن مجید نے جب اس لفظ کو اس اصل لغوی اساس سے اٹھا کر اسے اپنی ایک اصطلاح بنایا تو اس میں ایک اضافی مفہوم شامل ہو گیا۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں لفظ دین بالعموم قانون' ضابطہ اور شریعت کے معنوں میں آتا ہے' اس لیے کہ جزا و سزا کے ساتھ کسی نہ کسی قانون اور ضابطے کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ پھر اس میں اضافی مفہوم پیدا ہوا اطاعت کا۔ قرآن حکیم میں متعدد بار ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں' یعنی ''اطاعت کو اس (اللہ ہی) کے لیے خالص کرتے ہوئے''۔ اس لیے کہ کسی قانون یا ضابطے کی اگر اطاعت کی جائے گی تو جزا ملے گی' اور اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو سزا ملے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن مجید نے جب اسے دِيْنُ اللّٰهِ (النصر:۱) کی مرکب شکل میں ایک گھمبیر اصطلاح کا درجہ دیا تو اس میں جو مفہوم پیدا ہوا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے! کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کے قانون کے تحت جو زندگی بسر کی جائے گی وہ زندگی گویا اس کے دین کے اندر رہتے ہوئے گزاری جا رہی ہے۔ یہ ہے دین کا گھمبیر' ہمہ گیر اور جامع تصور جسے قرآن مجید نے ایک بہت اہم اصطلاح کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں غور کیجیے کہ اگر کسی جگہ بادشاہت کا نظام قائم ہے' ایک فردِ واحد کو ہی حاکمِ مطلق (sovereign) ہونے کی حیثیت حاصل ہے' اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے تو یہ گویا کہ ''دِيْنُ الْمَلِك'' ہے۔ اس لیے کہ اس نظام میں بادشاہ مطاعِ مطلق ہے۔ یہ لفظ بعینہٖ اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں وارد ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے ایک خاص واقعے کے ضمن میں ''دِيْنُ الْمَلِك'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ واقعہ لمبا ہے' مختصراً یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور ان کے بھائی قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کے پاس غلہ حاصل کرنے کے لیے آئے تو انہوں نے اپنے حقیقی بھائی بن یامین کو' جسے انہوں نے خاص طور پر فرمائش کر کے بلوایا تھا' اپنے پاس روکنا چاہا' لیکن چونکہ انہوں نے خود کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کیا تھا' بلکہ بھائی اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کا واسطہ جس ''عزیزِ مصر'' سے ہے وہ ان کا بھائی یوسف ہے' لہٰذا بن یامین کو اپنے پاس روکنے کا کوئی معقول سبب بظاہر بھائی نہیں دیتا تھا' تب اللہ تعالیٰ

نے انہیں ایک خاص طریقہ سجھایا اور ایک خصوصی تدبیر کے ذریعے وہ اپنے بھائی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ سورۂ یوسف میں اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: ﴿مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ.....﴾ (آیت ۷۶) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اُس بادشاہی نظام کے اندر رہتے ہوئے (جس میں وہ خود ایک اہم عہدہ پر فائز تھے) یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی بن یامین کو روک سکتے۔ تو یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی فردِ واحد کو مختارِ مطلق اور مطاعِ مطلق مان کر اس کے تحت جو اجتماعی نظام کسی جگہ پر قائم ہو گا اسے **دِيْنُ الْمَلِك** کہا جائے گا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آپ دورِ جدید کے مقبول ترین نظام یعنی جمہوریت کو ''**دِيْنُ الْجَمْهُوْرِ**'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نظام میں اصل حاکمیت جمہور کی ہے۔ ان کے نمائندے کثرتِ رائے سے جس چیز کو چاہیں جائز قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں ناجائز قرار دے دیں۔ یہ ایک مکمل نظام ہے' پورا دین ہے' جسے بجا طور پر دین جمہور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں غور کیجیے کہ ''دین اللہ'' اور ''دین حق'' کا مفہوم کیا ہو گا! وہ نظام جس میں اللہ ہی کو مطاعِ مطلق تسلیم کیا جائے' حاکمیتِ مطلقہ (sovereignty) صرف اسی کے لیے ہو۔ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری!

اس اصول پر مبنی پورے نظامِ زندگی کا جو مکمل ڈھانچہ استوار ہو گا وہ کہلائے گا ''دین اللہ''۔ یہ ''دین اللہ'' یا ''دین حق'' ہے جو نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ وہ دوسری چیز ہے جو آپؐ کو عطا ہوئی تھی۔ ذہن نشین کر لیجیے کہ پہلی چیز جو آپؐ کو عطا ہوئی وہ ہے ''الہدیٰ''، یعنی قرآن حکیم اور دوسری شے جو دے کر آپؐ مبعوث فرمائے گئے اسے قرآن نے ''**دِيْنُ الْحَق**'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی عدل وقسط پر مبنی ایک مکمل نظامِ اجتماعی' ایک مکمل ضابطۂ حیات' ایک کامل نظامِ اطاعت جس میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ضابطہ وقانون موجود ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال یہ آ سکتا ہے کہ کیا قرآن میں کامل نظام نہیں ہے؟ ''الہدیٰ'' کے بعد حرف ''وٗ'' واوِ عطف ہے اور واوِ عطف مغائرت کا متقاضی ہے۔ پھر کیا ''دین الحق'' قرآن سے کوئی جدا شے ہے؟ تو واقعہ یہی ہے کہ صرف قرآن پر مبنی کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں صرف اصول دیے گئے ہیں اور زندگی کے ہر گوشے کے متعلق صرف حدود کو معین کر دیا گیا ہے۔ ایک مکمل نظام اگر بنتا ہے تو وہ قرآن پر سنتِ رسولؐ کے اضافے سے بنتا ہے۔ اس خاکے کے اندر اگر رنگ بھرا جا سکتا ہے تو وہ سنت رسولؐ کے اضافے سے بھرا جا سکتا ہے۔ ایک مکمل نظام کی تشکیل کتاب اور سنت دونوں کے مجموعے سے ہو گی۔ یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی گئی ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان کی جو بھی کبھی کوئی دستوری دستاویز بنی ہے تو اس میں یہ الفاظ صحیح طور پر شامل ہوئے ہیں:

"No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

اس لیے کہ قرآن وسنت کے اجتماع ہی سے دینِ حق مکمل ہوتا ہے اور ایک پورا نظام تشکیل پاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے لیے وقت کی تعیین

اب آگے بڑھنے سے پہلے ایک اہم علمی حقیقت کی طرف توجہ مبذول فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اب ذرا ذہن کے سامنے ایک سوالیہ نشان لائیے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت کا وقت معین کرنے میں اللہ کی کون سی حکمت تھی؟ اس کی تفتیش کیجیے تو عجیب حقائق سامنے آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارضی پر نسلِ انسانی کی تاریخ اور تاریخِ نبوت دونوں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان ہی نہیں پہلے نبی بھی تھے۔ انسانیت اور نبوت کے یہ قافلے ساتھ ساتھ چلے ہیں اور دونوں قافلوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ انسان نے بھی ارتقائی مراحل طے کیے ہیں

اور نبوت و رسالت میں بھی ایک ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے آج سے چودہ سو برس پہلے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر اپنی جوانی میں قدم رکھا ہے۔ قرآن مجید میں الفاظ آتے ہیں: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ﴾ (الاحقاف:۱۵) ''جب وہ اپنی پوری قوت (پختگی) کو پہنچ گیا.....''۔ تو نسلِ انسانی بحیثیتِ مجموعی دو اعتبارات سے ایک بلوغ اور پختگی کو پہنچی ہے اُس وقت جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ انسانی ذہن اور اس کے فکر و شعور کے ارتقاء کا ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے۔ اور جس طرح ایک بچے پر عہدِ طفولیت کے بعد لڑکپن، جوانی اور پھر عقل کی پختگی کے سارے اَدوار آتے ہیں اسی طرح نسلِ انسانی ان تمام مراحل سے گزری ہے۔ انسان کو کامل اور مکمل ہدایت روزِ اوّل سے نہیں دی جا سکتی تھی۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ ''نعوذ باللہ من ذٰلک'' اُس وقت اللہ کے پاس کامل ہدایت تھی نہیں۔ بلکہ اللہ کے پاس تو تھی، لیکن انسان ابھی اس قابل نہ تھا کہ اُس کو حاصل کر سکتا۔ ذہنی اور فکری اعتبار سے وہ ابھی اس سطح تک نہ پہنچا تھا کہ اس کو ابدی ہدایت نامے کا اہل سمجھا جاتا۔ لہٰذا عبوری دَور میں ہدایات دی جاتی رہیں، کتابیں نازل ہوتی رہیں، صحیفے اُترتے رہے، ابتدائی احکام دیے جاتے رہے، تا آنکہ انسان اپنی عقل و شعور کی پختگی کو پہنچ گیا اور فکر کی سطح کے اعتبار سے اس کا اہل ہو گیا کہ ابدی ہدایت نامہ اب اسے دے دیا جائے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔

نوعِ انسانی کی ذہنی و فکری بلوغت کا دَور

میں یہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب مرحوم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو اگرچہ معروف تو کچھ دوسرے اعتبارات سے تھے، انہوں نے علامہ اقبال کی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں سے مل سکا ہوں ان میں مجھے اپنے محدود علم کے مطابق فلسفہ، تاریخِ فلسفہ، تاریخ مذاہب اور منطق وغیرہ میں مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان کی ٹکر کا نہیں ملا۔ انہوں نے ایک روز برسبیلِ تذکرہ یہ بات کہی کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کے بارہ سو برس بڑے اہم اور بہت productive ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بارہ سو سال کے دوران انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا اور اس کی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ چکی۔ یہ ہیں چھ سو قبل مسیح سے لے کر چھ سو بعد مسیح تک کے بارہ سو برس، جن کے دوران تمام مکتبہ ہائے فکر، تمام مدارسِ فلسفہ اور تمام مذاہب جو بھی پیدا ہونے تھے، ہو چکے، اس کے بعد کوئی نیا مذہب اور کوئی نیا فلسفہ وجود میں نہیں آیا۔ دَورِ حاضر میں یہ سارے جو نام لیے جاتے ہیں اور بڑی بھاری بھرکم اصطلاحات میں مغرب کے جو نئے فلسفے سمجھے جاتے ہیں، وہ Logical Positivism ہو یا Existentialism ہو، یہ سب نئے لیبلوں سے نئی بوتلوں میں پرانی شرابوں کے سوا کچھ نہیں۔ انسان جو کچھ بحیثیتِ انسان سوچ سکتا تھا وہ چھ سو بعد مسیح تک سوچ چکا تھا اور اس کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔

چشتی صاحب مرحوم سے یہ بات سن کر میرا ذہن فوراً منتقل ہوا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کا گہرا تعلق ہے بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے زمانے اور وقت کے تعین کے ساتھ کہ جب انسان سوچ چکا جو کچھ کہ وہ سوچ سکتا تھا، سقراط، ارسطو اور افلاطون اپنے نظریات دنیا کے سامنے رکھ چکے، فلاسفۂ ہند نے عقل کی جو بھی جولانیاں ہو سکتی تھیں وہ دکھا لیں، فلاسفۂ یونان اور فلاسفۂ چین اور ایران انسان کو جو کچھ دے سکتے تھے دے چکے، تب وہ **الکتاب** اور **الھُدیٰ** اس دعوے کے ساتھ نازل ہوئی کہ یہ ہدایتِ تامّہ ہے، یہ آخری اور مکمل ہدایت ہے جو اَب انسان کو دی جا رہی ہے۔ اور آپ غور کیجیے، اس حقیقت کا اس سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اللہ نے اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحِجر) ''یقیناً ہم نے ہی اس الذّکر (قرآن مجید) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ سوچیے، تورات بھی اللہ ہی کی کتاب تھی، اگر اللہ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا تو کیا اس میں تحریف ممکن ہوتی؟ بلکہ میں اس کے برعکس یوں کہوں گا کہ اگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن مجید کو بخش دیتے؟ کیا اُمتِ مسلمہ اس میں تحریف نہ کر دیتی؟ کیا معنوی تحریف ہمارے

ہاں نہیں ہوئی؟ یہ جو حفاظتِ خصوصی قرآن کو دی گئی اور تورات‘ زبور اور انجیل کو نہ دی گئی‘ اس کا کیا سبب ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی جناب میں یہ شکوہ کریں کہ پروردگار! یہ ہم سے سوتیلی بیٹیوں والا معاملہ کیوں ہوا؟ ہم بھی تیری کتابیں تھیں‘ ہمیں تو نے تحفظ کیوں نہ دیا؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ ابھی عبوری دَور کی ہدایات تھیں‘ جب نسلِ انسانی ابھی عقل اور شعور کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس عبوری دَور کی حفاظت لازمی نہ تھی۔ ان کو مستقل بنانا اور محفوظ رکھنا ضروری نہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہی کتاب ہے جس کے سابقہ ایڈیشن پہلے دیے گئے اور یہ اسی کا کامل اور مکمل آخری ایڈیشن ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا۔

اجتماعی شعور کی پختگی

اب آیئے دوسرے مضمون کی طرف! ’’دِیْنِ الْحَق‘‘ کے الفاظ میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک اور اعتبار سے بلوغ کو پہنچنے کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں کہ انسان نے انفرادیت سے تدریجاً اجتماعیت کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی صرف ایک قبیلے کی زندگی تھی‘ پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں‘ پھر بڑی بڑی مملکتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ عظیم سلطنتوں کا دَور تھا جب محمدٌ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اُس وقت قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں قائم تھیں جن کے مابین تاریخ کئی سو برس سے جھولا جھول رہی تھی۔ ان سلطنتوں کی لکھوکھ ہا کی تعداد میں مستقل اور تیار فوجیں (standing armies) تھیں۔ یہ تربیت یافتہ مسلح افواج تھیں۔ یہ وہ دَور تھا جبکہ محمد عربی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔ گویا کہ انسان اجتماعی اعتبار سے بھی اب اس سطح پر آ گیا تھا کہ اس کی ضرورت اب ایک اجتماعی نظام کی تھی۔ صرف انفرادی اخلاقیات اب اس کی ضرورت کی کفالت نہ کر سکتے تھے۔ انفرادی اخلاقیات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اب ضرورت تھی ایک اجتماعی نظام کی‘ ایک ایسے نظامِ عدل وقسط کی جس میں انسانی زندگی کے جو بھی متصادم (conflicting) تقاضے ہیں ان کو اس طریقے سے سمو دیا جائے کہ ان میں اعتدال بھی ہو اور توازن بھی ہو‘ کوئی تقاضا کسی دوسرے تقاضے کے نیچے دب نہ جائے‘ انفرادیت بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعیت کے حقوق بھی محفوظ رہیں۔ مرد کی قوامیت بھی مجروح نہ ہو اور عورت کے حقوق بھی اس طرح پامال نہ ہو جائیں کہ وہ بھیڑ بکری کی طرح صرف ملکیت بن کر رہ جائے۔ اسی طرح زندگی کے اندر جو مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور جو مختلف نزاعات وجود میں آ چکے تھے انسان کو اُن سب کا ایک معتدل اور متوازن حل درکار تھا۔ یہ ہے اس دَور کے انسان کی اصل ضرورت! اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انسان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ وہ ایک دین لے کر آئے‘ ایک نظام لے کر آئے۔ یہ نظامِ اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا نظام ہے اور یہ توازن اور اعتدال کی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہی توازن اور اعتدال ہے جس کی وجہ سے سورۃ الحدید میں اس دینِ حق کو ’’اَلْمِیْزَان‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ میزان ہے‘ یہ تول دینے والی شے ہے‘ افراد کے حقوق کو معین کرنے والی‘ عورت اور مرد کے حقوق و اختیارات اور فرائض کو معین کرنے والی اور تول دینے والی میزان ہے۔ یہ فرد اور اجتماعیت کے مابین اور سرمائے اور محنت کے مابین توازن پیدا کرنے والی میزان ہے‘ جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دینِ حق کی شکل میں دے کر بھیجا گیا۔

’’لِیُظْهِرَهٗ‘‘ کا مفہوم

اس کا لفظی ترجمہ ہوگا ’’تاکہ وہ غالب کر دے اُس کو‘‘۔ اس میں جو ضمیریں وارد ہوئی ہیں ان کے بارے میں مفسرین کے ہاں ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کا ہمیں تفصیلاً تجزیہ کرنا ہوگا۔ ایک ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے: ’’تاکہ اللہ غالب کر دے اس دین کو‘‘۔ اسی طرح یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے: ’’تاکہ اللہ غالب کر دے محمد (ﷺ) کو‘‘۔ اور ایک ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ’’تاکہ محمدؐ غالب کر دیں اس دین کو‘‘۔ ضمیرِ فاعلی اور ضمیرِ مفعولی کے مراد مختلف معین کرنے کی وجہ سے درحقیقت ترجموں میں یہ فرق واقع ہوا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی فرق کے باوجود اس کے اصل مفہوم اور معنیٰ میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لفظ ’’اظہار‘‘ پر غور

کیجیے۔ظَھَرَ ' یَظْھَرُ کا مفہوم ہے کسی چیز کا ظاہر ہو جانا۔اور اسی میں ایک مفہوم غالب ہو جانے کا بھی شامل ہے' اس لیے کہ کوئی چیز نمایاں اور ظاہر اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے ماحول پر غالب ہوتی ہے۔اسی سے بابِ افعال میں مصدر بنا ہے ''اِظہار'' یعنی غالب کر دینا۔اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں ظَھْر کہتے ہیں پیٹھ کو۔کسی کی پیٹھ پر سوار ہو جانا اُس پر غالب ہونے کے مترادف ہے۔تو اِظہار کا یہ مفہوم مسلّم ہے۔

لِیُظْھِرَہٗ کی ضمیرِ فاعلی کے بارے میں جو دو رائیں ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کا مدلول ایک ہی ہے۔چنانچہ ''غالب کرنے والا'' خواہ اللہ کو قرار دیا جائے خواہ رسول اللہ ﷺ کو' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔اس لیے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو صرف اللہ ہی ہے۔اگرچہ اس دنیا میں بظاہر ہم محنت و مشقت سے روزی کماتے ہیں' لیکن ہمارا رازق اللہ ہی ہے۔انسان تو محض کاسبِ اعمال ہے' خالقِ اعمال صرف اللہ ہے۔چنانچہ اس عمل ''اظہار'' کے کرنے والے عالمِ اسباب میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہیں' اور عالمِ حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔لہٰذا مراد اور معنی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔جس طرح کہ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ ۪ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۚ﴾ (آیت ۱۷) کہ اے مسلمانو! یہ ستّر سردارانِ قریش جو تمہارے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے ہیں' انہیں تم نے قتل نہیں کیا' بلکہ درحقیقت اللہ نے انہیں قتل کیا ہے' اور اے نبیؐ! وہ مٹھی بھر کنکر جو آپ نے لشکرِ کفار کی طرف پھینکے تھے تو وہ آپؐ نے نہیں پھینکے تھے' اللہ نے پھینکے تھے۔معلوم ہوا کہ عالمِ واقعہ میں یا بالفاظِ دیگر عالمِ اسباب میں غلبۂ دین کے لیے محنت' جدّ و جہد' سرفروشی اور جہاد و قتال کرتے نظر آتے ہیں محمد ﷺ اور آپؐ کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' لیکن حقیقت کی سطح پر فاعلِ حقیقی صرف اللہ ہے۔

اسی طرح کا معاملہ لِیُظْھِرَہٗ میں شامل ضمیرِ مفعولی کا ہے۔چنانچہ اس سے خواہ دین کو غالب کرنا مراد لیا جائے چاہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو' مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔اس لیے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد کا مقصود ہرگز اپنی ذات کا غلبہ نہ تھا۔یہ بھاگ دوڑ اور سعی و جہد اپنی یا اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لیے ہرگز نہ تھی۔رسول اللہ ﷺ کا غلبہ درحقیقت اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔لہٰذا لفظی ترجمہ چاہے جو بھی کیا جائے اور ضمیروں کے مراجع کے بارے میں خواہ کوئی بھی رائے قائم کی جائے' مفہوم ایک ہی رہے گا۔

اب تک اس آیۂ مبارکہ میں جو کچھ مضمون آیا ہے اسے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اللہ نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو دو چیزیں دے کر: (۱) الہدیٰ اور (۲) دینِ حق۔کیوں بھیجا؟ اس کا جواب درحقیقت اس لفظ لِیُظْھِرَہٗ میں بیان ہوا ہے۔یعنی اس لیے بھیجا تاکہ اس دینِ حق کو غالب کر دے پورے نظامِ زندگی پر (عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ)۔

لفظ ''دین'' کے ترجمہ میں بھی ہمارے ہاں کچھ اختلاف رہا ہے۔بعض لوگوں نے ''تمام اَدیان'' ترجمہ کر دیا ہے' بعض نے ''سب دین'' ترجمہ کیا ہے' اسی طرح بعض لوگوں نے اس سے ''کُل دین'' اور بعض نے ''جنسِ دین'' مراد لیا ہے۔یہ مؤخر الذکر ترجمہ درحقیقت اصل مفہوم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔گویا اس کا اصل مفہوم اور معنی یہ ہوگا کہ یہ دینِ حق غالب ہو جائے پورے جنسِ دین پر۔پورے نظامِ زندگی پر اللہ کا نظام اس شان سے قائم ہو جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل و قسط زندگی پر بحیثیت ایک وحدت اور ایک ''organic whole'' کے نافذ و غالب ہو جائے۔یہ ہے مقصد محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا۔

''دین'' اور ''مذہب'' میں فرق

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ لفظ ''دین'' اور لفظ ''مذہب'' میں مفہوم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو مذہب کہا جاتا ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اور حدیث کے پورے ذخیرے میں

اسلام کے لیے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا' بلکہ اس کے لیے ہمیشہ ''دین'' ہی کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قف﴾ (آیت ۱۹) ''یقیناً اللہ کے ہاں (اُس کی بارگاہ میں مقبول) دین تو صرف اسلام ہے''۔

دین اور مذہب میں بنیادی فرق کو سمجھ لیجیے! مذہب ایک جزوی حقیقت ہے۔ یہ صرف چند عقائد (dogma) اور کچھ مراسمِ عبودیت (rituals) کے مجموعے کا نام ہے۔ جبکہ دین سے مراد ہے ایک مکمل نظام جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ گویا مذہب کے مقابلے میں دین ایک بڑی اور جامع حقیقت ہے۔ اس پس منظر میں اگرچہ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہو گا کہ اسلام مذہب نہیں ہے' اس لیے کہ مذہب کے جملہ عناصر (elements) بھی اسلام میں شامل ہیں' اس میں عقائد کا عنصر بھی ہے' ایمانیات ہیں' پھر اس کے مراسمِ عبودیت ہیں' نماز' روزہ ہے' حج اور زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ صحیح یہ ہو گا کہ یوں کہا جائے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں' ایک دین ہے۔ اس میں جہاں مذہب کا پورا خاکہ موجود ہے وہاں یہ ایک مکمل نظامِ زندگی بھی ہے' بلکہ اصلاً یہ دین ہے۔

اب اس حوالے سے ایک اہم حقیقت پر غور کیجیے! کسی ایک خطۂ زمین میں مذاہب تو بیک وقت بہت سے ہو سکتے ہیں' لیکن دین ایک وقت میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ نظام تو لازماً ایک ہی ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کسی خطۂ زمین پر یا کسی ایک ملک میں بیک وقت قائم ہوں! حاکمیت (sovereignty) تو کسی ایک ہی کی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت کسی ملک میں نافذ ہو جائیں۔ نظام ایک ہی رہے گا۔ اللہ کا نظام ہو گا یا غیر اللہ کا ہو گا۔ نظام دو ہرگز نہیں ہو سکتے' جبکہ ایک خطۂ زمین میں مذاہب بیک وقت بہت سے ممکن ہیں۔ (۱) ہاں نظاموں کے ضمن میں ایک امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک نظام غالب و برتر ہو' اور وہی حقیقت میں ''نظام'' کہلائے گا' اور دوسرا نظام سمٹ کر اور سکڑ کر ایک مذہب

(۱) یہ بات اس حقیقت سے بہت مشابہ ہے جو ایک کہاوت کے طور پر بیان کی جاتی ہے کہ دس درویش ایک گدڑی میں گزارا کر سکتے ہیں' لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں اکٹھے نہیں رہ سکتے!

کی شکل اختیار کر لے اور اس کے تابع زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ ہے درحقیقت ایک امکانی حالت! میرا ذہن منتقل ہوا علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف کہ: ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

دین کب مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے؟

دین جب مغلوب ہوتا ہے تو ایک مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں وہ دین نہیں رہتا' بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اسلام کے دَورِ عروج میں غالب نظام تو اسلام کا تھا' لیکن اس دین کے تابع یہودیت' مجوسیت اور نصرانیت مذاہب کی حیثیت سے برقرار تھے۔ انہیں یہ رعایت دی گئی تھی اور صاف الفاظ میں سنا دیا گیا تھا کہ اگر وہ اسلامی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا ہو گا اور چھوٹے بن کر رہنا ہو گا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿......یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ) ''......وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں''۔ ملکی قانون (law of the land) اللہ کا ہو گا' غالب نظام اللہ کا ہو گا' اس کے تحت اپنے پرسنل لاء میں اور اپنی ذاتی زندگی میں محدود سطح پر وہ اگر اپنے مذاہب اور اپنے عقائد و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہو گی۔ اسلام کے دَورِ زوال و انحطاط میں یہ صورت برعکس ہو گئی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس برعظیم میں دین انگریز کا تھا' law of the land اُس کا تھا۔ دینِ انگریز کے تحت اسلام نے سمٹ کر ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی کہ نمازیں جیسے چاہو پڑھو' انگریز کو کوئی اعتراض نہ تھا' اذانیں بخوشی دیتے رہو' وراثت اور شادی بیاہ کے معاملات بھی اپنے اصول کے مطابق طے کر لو' لیکن ملکی قانون انگریز کی مرضی سے طے ہو گا۔ یہ معاملہ تاجِ برطانیہ کی sovereignty کے تحت ہو گا' اس میں تم مداخلت نہیں کر سکتے! یہ تھا وہ تصور جس کے بارے میں اقبال نے بڑی خوبصورت پھبتی چست کی تھی: ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یعنی اسلام آزاد کہاں ہے؟ وہ سمٹ سکڑ کر اور اپنی اصل حیثیت سے بہت نیچے اتر کر ایک مذہب کی شکل میں باقی ہے! اللہ اللہ اور خیر صلّا!

نفاذِ دین کے بغیر اتمامِ حجت ممکن نہیں!

دین ہے ہی وہ کہ جو غالب ہو۔ اگر مغلوب ہے تو وہ دین نہیں رہے گا' بلکہ ایک مذہب کی صورت میں سمٹ اور سکڑ جائے گا' اس کی اصل حیثیت مجروح ہو جائے گی۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نظام بھی اگر صرف نظری اعتبار سے پیش کیا جا رہا ہو' صرف کتابی شکل میں نسلِ انسانی کو دیا گیا ہو تو وہ ایک خیالی جنت (utopia) کی شکل تو اختیار کر سکتا ہے' لیکن حجت نہیں بن سکتا۔ نوعِ انسانی پر حجت وہ صرف اُس وقت بن سکتا ہے جب اسے قائم کر کے' نافذ کر کے اور چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ ہے بعثتِ نبویؐ کی وہ امتیازی شان اور کٹھن ذمہ داری جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر عائد ہوئی کہ آپؐ جو دین حق دے کر بھیجے گئے ہیں اسے پورے نظامِ زندگی پر غالب و قائم اور نافذ و رائج فرما دیں۔ ایک حدیث مبارک میں اس حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا گیا کہ: ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا))(۱) ''تاکہ اللہ کی بات ہی سب سے بلند ہو۔'' اس کی مرضی سب سے بالاتر ہو اور اس کا جھنڈا سب سے اونچا ہو جائے۔

سورۃ المدّثّر میں اس اہم مضمون کو دو الفاظ میں سمو دیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! کھڑے ہو جاؤ' کمربستہ ہو جاؤ' اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جدّ و جہد کا آغاز کرو! اور اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اِنذار۔ یعنی خبردار کرو' اُن نیند کے ماتوں کو جگاؤ' جو بھول گئے ہیں اس حقیقت کو کہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت) ''اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا''۔ یہ ہے نبی اکرم ﷺ کے مشن کا نقطۂ آغاز! اور اس کا ہدفِ مقصود اور اس کی غایتِ قصویٰ کیا ہے؟ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ''اور اپنے ربّ کو بڑا کرو!'' تکبیر کے معنی صرف یہ نہیں کہ بڑائی کا اعلان یا اعتراف کر لیا جائے' زبان سے اللہ اکبر کہہ دیا جائے' بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کی بڑائی نافذ ہو جائے' اس کی کبریائی کے اعتراف پر مبنی نظام بالفعل قائم ہو جائے' اسی کی بات سب سے اونچی اور اسی کا حکم سب سے بالا ہو۔ یہ ہے تکبیر ربّ کا حقیقی مفہوم۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں تکبیر ربّ کے اس انقلابی تصور کو شعر کا لبادہ اوڑھایا ہے:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

اسی مضمون کو انہوں نے کسی قدر ظریفانہ انداز میں یوں بیان کیا:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اَذاں اور ' مجاہد کی اَذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

تکبیر ربّ کا کچھ یہی مفہوم حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ میں بھی سامنے آتا ہے کہ ''اے ربّ! جیسے تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو''۔

دینِ حق کا نفاذ انقلابی جدّ و جُہد کا متقاضی ہے

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ سورۃ الصّف کی زیرِنظر آیت کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا جو مشن سامنے آتا ہے اس کا تقاضا محض دعوت و تبلیغ' بشارت و انذار یا تعلیم

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من سأل وهو قائم عالما جالسا۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله۔

وتربیت سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہ ایک انقلابی مشن ہے۔ ایک نظام کو کسی معاشرے پر برپا کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے وہاں پر موجود نظام کو جڑوں سے اکھیڑا جائے۔ یہ کام خلاء میں کیا جانے والا نہیں ہے۔ جہاں بھی دینِ حق کے نفاذ کی جدّ وجہد کی جائے گی کوئی نہ کوئی نظام وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ اُس باطل نظام کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں گے‘ سیادتیں اور چودھراہٹیں ہوں گی‘ لوگوں کے مالی مفادات ہوں گے۔ آپ جب اُس نظام کو ذرا سا چھیڑیں گے‘ اس کے خلاف ذرا آواز بلند کریں گے تو نمعلوم کس کس کے کن کن مفادات پر آنچ آئے گی! چنانچہ وہ تمام قوتیں اپنے اس نظام کی مدافعت میں آپ کے خلاف متحد ہو جائیں گی کہ ع

’’نظامِ کہنہ کے پاسبانو‘ یہ معرضِ انقلاب میں ہے!‘‘

اپنے نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر وہ سب مجتمع ہو کر آپ کے خلاف صف آراء ہو جائیں گے۔ تصادم‘ کشمکش اور جہاد وقتال کا مرحلہ لازماً آ کر رہے گا۔ چنانچہ اس مقصد بعثت کے اعتبار سے جو سورۃ الصّف کی اس آیت میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لیے معین ہوا ہے‘ انقلابی جدوجہد لازم اور ناگزیر ہے۔ یہ محض دعوت وتبلیغ سے ہونے والی بات نہیں!

اگرچہ سورۃ الجمعہ کے حوالے سے اگلے درس میں یہ بات آئے گی کہ اس انقلابی جدوجہد کا منہج اساسی یقیناً دعوت وتبلیغ ہے‘ اس کے ابتدائی مراحل میں یقیناً تعلیم بھی ہے‘ تربیت بھی ہے اور تزکیہ بھی ہے‘ لیکن ان ابتدائی اور اساسی مراحل سے بلند تر سطح پر ایک انقلابی جدّ وجہد بھی ناگزیر ہے‘ ایک تصادم کہ جس میں کشت وخون کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیّبہ میں جہاں ہمیں دعوت وتبلیغ کا مرحلہ نظر آتا ہے وہاں جہاد وقتال کے مراحل بھی آئے۔ حنین کی وادی میں آپؐ یہ رجز پڑھتے ہوئے اپنے لشکر کی کمان کرتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں: ((اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ‘ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) یہ وہ بات ہے جو اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کی اس منفرد اور امتیازی شان کو نہیں سمجھا کہ آپؐ صرف داعی اور مبلغ نہ تھے‘ آپؐ محض مبشر اور نذیر نہ تھے‘ آپؐ صرف مزکی‘ مربی اور معلم نہ تھے‘ آپؐ تاریخِ انسانی کے عظیم ترین انقلاب کے داعی اور نقیب بھی تھے۔ کون انکار کر سکتا ہے اس حقیقت سے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے برپا فرمایا‘ جس نے زندگی کے ہر گوشے کو بدل کر رکھ دیا! ایسا ہمہ گیر انقلاب جس نے لوگوں کے افکار بدلے‘ عقائد بدلے‘ نظریات بدلے‘ کردار بدلے‘ حتیٰ کہ لوگوں کے شب و روز کے انداز اور نشست و برخاست کے طریقے بدل گئے۔ وہ قوم کہ جس کے اندر کوئی کسی کی بات سننے والا نہ تھا‘ انتہائی منظّم قوم بن گئی۔ اس معاشرہ نے کہ جہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھے‘ دنیا کو معلم فراہم کیے۔ نبی اکرم ﷺ نے نوعِ انسانی کو ایک نئی تہذیب اور ایک نیا تمدن عطا کیا۔ بلاشبہ یہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا یہ پہلو کہ آپؐ عظیم داعیٔ انقلاب تھے‘ درحقیقت آپؐ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے جو اِن الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا: ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾۔

’’اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!‘‘

مہاتما گاندھی کے بارے میں غالباً جارج برنارڈ شا نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے کہ:

" He is a saint among politicians and a politician among saints".

اگرچہ ع ’’چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک‘‘ کے مصداق ان الفاظ کی یا ان جیسے الفاظ کی کوئی دُور کی نسبت بھی آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے نہیں ہو سکتی‘ تاہم واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے فہم کے لیے اگر یوں تعبیر کیا جائے تو شاید بات غلط نہ ہوگی کہ:

"He was a revolutionary among prophets and a prophet among revolutionaries."

یعنی نبیوں اور رسولوں میں آپ ﷺ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپؐ ایک عظیم انقلابی رہنما ہیں‘ اور انقلابی رہنماؤں میں آپؐ کی منفرد شان یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے نبی اور

رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے صرف دعوت وتبلیغ کا کام نہیں کیا' بلکہ اس دعوت کی بنیاد پر ایک انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دعوت وتبلیغ کے ابتدائی مرحلے سے کام کا آغاز کیا اور کُل تیئیس (۲۳) برس میں اس جدوجہد کو ایک نظام کے باقاعدہ قیام اور باضابطہ نفاذ کے تکمیلی مرحلے تک پہنچا دیا۔ اگرچہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں آپ ؐ کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جو کسی بھی انقلابی جدّوجہد میں آتے ہیں۔ زمین پر قدم بقدم چل کر نبی اکرم ﷺ نے وہ مرحلے طے کیے۔ آپ ؐ کو فقر وفاقے کی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑی۔ شعبِ بنی ہاشم میں تین سال کی قید کو ذہن میں لائیے کہ جس میں وہ وقت آیا کہ فقر وفاقے کی شدت سے بنی ہاشم کے دودھ پیتے بچے بلک رہے تھے اور ان کے کھانے کے لیے کوئی چیز میسر نہ تھی' سوائے اس کے کہ سوکھے چمڑوں کو اُبال کر اس کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ طائف میں آپ ﷺ کو شدید پتھراؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ مکے کی گلیوں میں آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ یہ منظر بھی چشم فلک نے دیکھا کہ آپ ﷺ سربسجود ہیں اور ایک شقی انسان عقبہ بن ابی معیط ابوجہل کے کہنے سے اٹھتا ہے اور اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی لاکر شانۂ مبارک پر رکھ دیتا ہے۔ پھر غارِ ثور کا مرحلہ بھی آیا۔

میدانِ بدر کا وہ نقشہ بھی ذہن میں لائیے کہ اللہ کا رسول ؐ ان دونوں لشکروں کے درمیان گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں سربسجود ہے اور اللہ سے گڑگڑا کر نصرت کی درخواست کر رہا ہے۔ پھر اُحد کا سخت مرحلہ بھی آیا۔ آپ ؐ کے دندانِ مبارک شہید اور چہرۂ انور لہولہان ہو گیا ہے۔ آپ ؐ پر کچھ دیر کے لیے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ آپ ؐ کے انتہائی جاں نثار ساتھی حضرت مصعب بن عمیر ؓ کا لاشہ بے گوروکفن پڑا ہے کہ جسم پر موجود چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ ؐ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ اسی میدانِ اُحد میں آپ ؐ کے انتہائی قریبی عزیز حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ؓ کا اعضاء بریدہ لاشہ پڑا ہوا ہے۔ آپ ﷺ کے قلبِ مبارک کی جو کیفیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے پر جب آپ ؐ نے دیکھا کہ گھر گھر سے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں' شہداء پر اُن کی رشتہ دار خواتین بین کر رہی ہیں' تو آپ ﷺ کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے: ((لٰکِنَّ حَمْزَةَ لَا بَوَاکِیَ لَهٗ)) (۱) ''ہائے حمزہ کے لیے تو کوئی رونے والی بھی نہیں!'' یہ تمام صدمے نبی اکرم ﷺ نے دیکھے اور یہ سب سختیاں جھیلی ہیں' تب یہ انقلاب آیا ہے۔ گویا ع ''اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری'' کے مصداق اس عظیم انقلابی جدوجہد میں نبی اکرم ﷺ کو اُن تمام مراحل اور مشکلات وموانع کا سامنا کرنا پڑا جو دنیا کی کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بہرکیف یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کی یہی امتیازی شان ہمارے سامنے رہنی چاہیے جو اس آیت کریمہ میں بیان ہوئی کہ: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ﴾ یعنی پورے کے پورے دین (نظامِ اطاعت) پر اس دینِ حق کو غالب وقائم کر دینا یہ ہے بعثتِ محمدیؐ کی غرض وغایت!

دو چشم کشا واقعات

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ یہ چیز بعثتِ انبیاء کے اساسی مقصد سے جدا نہیں ہے۔ دیکھئے' بعثتِ انبیاء کا اصل مقصد نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہے۔ اور یہ اسی اتمامِ حجت کا تکمیلی مرحلہ ہے کہ انسان کو اجتماعی نظام کے ضمن میں رہنمائی کے لیے عدل وقسط پر مبنی نظام کا ایک مکمل نمونہ دکھا دیا جائے۔ صرف نظری سطح پر پیش کر دینے سے وہ حجت مکمل نہیں ہوگی' بلکہ اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہوگا کہ اس نظام کو بالفعل قائم ونافذ کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا جائے۔ اس معاملے کی اہمیت کا حوالہ رواں صدی کے دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں پہلی بار مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں اُس وقت گاندھی نے اپنے کانگریسی ساتھیوں اور زعماء کے سامنے ایک عجیب بات کہی تھی' اور وہ یہ کہ ''میں اس موقع پر تمہارے سامنے حضرت ابوبکر (ؓ) اور

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب ما جاء فی الجنائز' باب ما جاء فی البکاء علی المیت۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال رکھتا ہوں' اس مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو!'' غور کیجیے گاندھی نے یہ بات کیوں کہی! اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس عہدِ جدید کے انسان کو جس نوع کے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اس نظام کا ایک کامل نقشہ اور ایک مکمل ماڈل اگر درکار ہے تو اس کی نظیر تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے دورِ خلافتِ راشدہ' یعنی وہ نظامِ عدلِ اجتماعی جو قائم فرمایا تھا محمد عربی ﷺ نے۔

ایک دوسرا واقعہ جو اس کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈال رہا ہے' مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے سے ہے۔ اس واقعہ سے دین حق کے قیام ونفاذ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی جب شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ریشمی رومالوں کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان گئے' اور جب افغانستان سے بھی گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر سرحد عبور کر کے انہیں روس جانا پڑا تو اُس وقت بالشویک انقلاب ابھی نیا نیا آیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر انقلاب کے مرکزی رہنماؤں کے سامنے اگر اسلام کا انقلابی پروگرام رکھا جائے تو کیا عجب کہ وہ اس کو قبول کر لیں' ابھی ان میں انقلابی جذبہ بھی ہے اور انقلاب کے نقطۂ نظر سے فضا سازگار بھی ہے۔ چنانچہ اس اُمید پر انہوں نے لینن سے بات کرنا چاہی' لیکن لینن بستر مرگ پر تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ٹراٹسکی سے بات کیجیے' چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی کی ٹراٹسکی سے مفصل گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے آخر میں اس نے پوچھا کہ مولانا! یہ نظام جو آپ پیش کر رہے ہیں بظاہر بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے' لیکن کیا آپ نے دنیا میں کہیں اسے قائم بھی کیا ہے؟ مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری نگاہیں زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئیں' دوبارہ میں اس سے آنکھیں چار نہیں کر سکا۔ سیدھی سی بات ہے کہ کوئی نظام حجت تب بنتا ہے جب اسے چلا کر دکھا دیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس اتمامِ حجت کو اپنے تکمیلی درجے تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے جہاں نظری' فکری اور اعتقادی ہدایت دی' انسان کی سوچ کو صحیح رُخ پر ڈالا' جہاں آپؐ نے انفرادی اخلاق کے ضمن میں انسان کی سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے ایک مکمل ہدایت نامہ عطا فرمایا' خود اپنی سیرت وکردار اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت وکردار کو اس رُخ پر ڈھال کر انفرادی اخلاق کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے نوعِ انسانی پر حجت تمام کی' وہاں آپؐ نے ایک جاں گسل جدوجہد کے ذریعے تیئیس سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں اس نظامِ عدل وقسط کو عملاً برپا کر دیا جس میں انفرادی آزادی بھی ہے' لیکن اجتماعیت کے حقوق بھی پورے طور پر محفوظ ہیں' جس میں مساواتِ انسانی بھی ہے' لیکن وہ انفرادی آزادی کی قیمت (cost) پر نہیں کہ مساوات تو ہو لیکن انسان شخصی آزادی سے یکسر محروم کر دیا جائے' بلکہ یہ دونوں اعلیٰ اقدار اس نظام میں بیک وقت موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان جس اعلیٰ قدر کا تصور کرے گا اسے وہ اس نظام میں موجود پائے گا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے :

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست

یہ ہے اصل کارنامہ حیاتِ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا جس کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی اس امتیازی شان کا فہم ضروری ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں وارد ہوئی: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

سورۃ الصّف کے مضامین کا جائزہ

سورۃ الصّف کے عمود کی تعیین اور اس کی مرکزی آیت کے اکثر حصے پر غور و فکر کر لینے کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورۂ مبارکہ پر بحیثیت مجموعی غور کریں۔ لیکن اس سے قبل اس سورۃ کی مرکزی آیت یعنی آیت ۹ کے آخری ٹکڑے کے حوالے سے ایک اور عظیم حقیقت کی طرف توجہ کرنا مفید ہوگا۔

آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الصّف کی یہ مرکزی آیت قرآن مجید میں تین مقامات پر آئی ہے۔ ایک مقام پر اس کا اختتام ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ کے الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس میں تو گویا اشارہ ہے اسی بات کی طرف جو اِس سے پہلے سورۃ الحج کے آخری رکوع کے درس کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے کہ رسول اگر اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیں تو گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس حوالے سے سیرتِ طیبہ کا وہ اہم واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا ہوگا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ نے تمام حاضرین سے یہ گواہی لینے کے بعد کہ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا' آسمان کی طرف انگشتِ شہادت اٹھا کر اور لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بھی تین بار عرض کیا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!))(۱) کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! میرے پاس تیری دو امانتیں پہنچی تھیں' ایک تیری کتاب' جسے میں نے اُمت تک بلاکم و کاست پہنچا دیا' حق تبلیغ ادا کر دیا' اور دوسری نعمت دین حق' جسے تیری تائید اور اپنے صحابہؓ کے تعاون سے میں نے تیئیس سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب پر بالفعل قائم کر دیا۔ اب یہاں تیرا ہی بول بالا ہے' تیرا ہی حکم نافذ ہے اور تیرا ہی جھنڈا سب سے بلند ہے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ اس کی شہادت اور گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔

بقیہ دو مقامات پر یعنی سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں یہ آیت ﴿وَلَوْ كَرِهَ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔

الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے— ''چاہے یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو''— اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ تصادم ناگزیر ہے۔ مشرک کبھی گوارا نہ کریں گے کہ اللہ کا دین یہاں قائم ہو' وہ نظامِ عدل وقسط عملاً برپا ہو جائے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ کفر اور شرک کی قوتیں دین حق کے لیے آسانی سے راستہ نہیں چھوڑیں گی۔ وہ لازماً retaliate کریں گی۔ تصادم ہو کر رہے گا' کشمکش ہو گی' لیکن اس سب کے علی الرغم' اس سب کے باوجود' رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے کہ اس دین کو قائم کریں' اسے غالب و نافذ کریں جو اللہ نے ان کو دے کر بھیجا ہے۔

مذہبی اور سیاسی شرک کا گٹھ جوڑ

یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے اور اس کا تعلق ہمارے اس منتخب نصاب میں شرک کی بحث سے جڑ جاتا ہے۔ شرک کے بارے میں یہ خیال بڑا عامیانہ اور سطحی سا ہے کہ اس کا تعلق محض مخصوص مذہبی امور کے ساتھ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں تاریخِ نسلِ انسانی کے دوران ہر دَور میں اور ہر خطۂ زمین میں شرک کے دو نظام ہمیشہ قائم رہے ہیں' ایک مذہبی شرک اور دوسرا سیاسی شرک۔ انہی دو راستوں سے درحقیقت نوعِ انسانی کا استحصال ہوتا چلا آیا ہے۔ مذہبی شرک کی شکل تو یہ ہے کہ کوئی پنڈت' کوئی پروہت' کوئی پادری' کوئی پجاری یا کوئی پیر کسی آستانے کا مجاور بن کر یا کسی بُت کدے کا پروہت یا پجاری بن کر لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوتا ہے اور مذہب کے نام پر عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے نذرانے اور چڑھاوے وصول کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاشی استحصال (economic exploitation) کی انتہائی مکروہ صورت ہے۔ بقولِ اقبال ع

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج!

دوسری جانب بادشاہت کے نظام کی صورت میں سیاسی شرک کا نظام تاریخ انسانی کے ہر دَور میں قائم رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اَوراق پر نظر دوڑائیں تو نظر آتا ہے کہ کہیں یورپ میں بادشاہوں کے خدائی اختیارات (Divine Rights of Kings) کا

راگ الاپا جا رہا ہے اور کہیں ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کی حکمرانی کا سلسلہ رواں ہے۔ یہ بادشاہ اور ملوک اپنے اقتدار و اختیار کے بل پر عوام سے خراج اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اس طرح انسانی تاریخ میں یہ دونوں مشرکانہ نظام ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے سے تعاون کرتے نظر آتے ہیں۔ اِدھر مذہبی طبقات کی طرف سے بادشاہِ وقت کو ''His Holiness'' کا خطاب مل رہا ہے تو اُدھر سے انہیں ''Defenders of the Faith'' کے خطاب سے نوازا جا رہا ہے۔ گویا ع من ترا حاجی بگویم تو مرا مُلّا بگو! یہ مذہبی شرک اور سیاسی شرک کے دو نظام جو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے اور جنہوں نے انسانوں کی گردنوں پر اپنی خدائی کا جواڈالے رکھا' ظاہر بات ہے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ یہ سارا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جائے اور یہ سارے مفادات آنِ واحد میں ختم ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے اسی پس منظر میں کہا تھا :؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو!
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اسلام ہے وہ نظام جو اِن درمیانی واسطوں کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے' جو یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ جہاں چاہو اور جب چاہو خدا سے ہم کلام ہو جاؤ:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ (البقرۃ)

''اور (اے نبیؐ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (انہیں بتا دیں کہ) میں قریب ہی ہوں' میں ہر پکارنے والے کی پکار (کو سنتا اور اس) کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے' تو چاہیے کہ وہ بھی میرا کہا مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں' تاکہ رشد و کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔''

وہ انسان پر سے انسان کی خدائی کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے۔ ع ''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے''۔ یہاں کوئی کسی کا آقا نہیں اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا بندہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا))(۱) ''سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ تمہارے مابین قوم' نسل اور رنگت کے اعتبار سے کوئی اونچ نیچ نہیں ہے' کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ ہے وہ انقلابی پیغام جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ ان اصولوں پر مبنی نظام کا قیام ظاہر بات ہے کہ اس مشرکانہ اور باطل نظام کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے' جہاں اس نظام سے لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کہ مشرکین کی طرف سے تو مخالفت ہو کر رہے گی۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ یہ نظامِ عدل و قسط دنیا میں قائم اور برپا ہو جائے' انسانوں کی گردنوں پر سے دو طرفہ غلامی کے جوئے اٹھا دیے جائیں' اور ان کی گردنوں میں سے وہ طوق اتار دیے جائیں جن کے بوجھ تلے نوعِ انسانی ہمیشہ دبی اور سسکتی رہی ہے۔ سورۃ الاعراف میں رسول اللہ ﷺ کی یہ شان ان الفاظ میں بیان ہوئی: ﴿وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾

آنحضور ﷺ کے مشن کا لازمی تقاضا' جہاد فی سبیل اللہ!

بہرحال اس آخری ٹکڑے یعنی ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے ضمن میں اس مختصر سی وضاحت کے بعد اب یہ بات جان لیجیے کہ سورۃ الصّف میں نبی اکرم ﷺ کے اس مقصد بعثت کی تعیین کے بعد اس کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے اب مضمون آ رہا ہے جہاد فی سبیل اللہ کا' کہ اے اہل ایمان! اب اس مشن کی تکمیل کے لیے کمر ہمت کس لو! دین اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا فرضِ منصبی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا۔ تو اب اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والوں اور ان پر ایمان کے دعوے داروں کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ اس مقصد کے حصول اور اس مشن کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو لگا دیں اور کھپا دیں۔ اس مقصد کے لیے جدّ و جہد کریں' کوششیں کریں اور اس راہ میں اپنے مال لگائیں' اپنی جانیں کھپائیں' اپنی قوتیں صرف کریں اور اپنے اوقات لگائیں کہ یہ ان

(۱) مسند احمد۔

کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ کے دین کو برپا کرنا اور اسے قائم و نافذ کرنا کسی ایک فردِ بشر کا کام نہیں۔ یہ ایک نہایت عظیم کام اور بہت اونچا نصب العین ہے اور اس کے لیے ایک بڑی بھرپور اجتماعی جدّ و جہد کی ضرورت ہے۔ اس اجتماعی جدّ و جہد میں نبی ﷺ کے دست و بازو بننا‘ اُن کا ساتھ دینا‘ ان کی نصرت کرنا اور جہاں اُن کا پسینہ گرا ہو وہاں اپنا خون بہا دینے کو اپنے لیے موجبِ فخر و سعادت جاننا ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ اس لیے کہ جب تک یہ کیفیت اللہ اور رسول ﷺ کے ماننے کے دعوے داروں میں پیدا نہ ہو اس مشن کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ سیرت النبیؐ اور سِیَر صحابہؓ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انقلاب اسی طور سے برپا ہوا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا تن من دھن سب کچھ اس راہ میں نچھاور کر دیا۔ غزوۂ خندق کا تصور کیجیے جبکہ بڑا ہی کٹھن وقت آن پڑا تھا۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی کو بارہ ہزار کا لشکر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اور اُس وقت جبکہ خندق کھودی جا رہی تھی اور پھاوڑے چل رہے تھے‘ یہ رجز اور ترانہ صحابہؓ کی زبانوں پر تھا:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدَا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدَا(۱)

کہ ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے بیعت کی ہے محمد ﷺ کے ہاتھ پر‘ جہاد کی بیعت کہ جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک جسم و جان کا تعلق برقرار ہے ہم اس جہاد‘ اس کوشش اور اس جدّ و جُہد میں لگے رہیں گے۔

ایک انتہائی نفع بخش تجارت!

سورۃ الصّف کی اس مرکزی آیت کے بعد اگلی ہی آیت میں مسلمانوں سے یہ سوال کیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰﴾ ’’اے اہل ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اُس تجارت (یا کاروبار) کی طرف جو تمہیں نجات دے ایک دردناک عذاب سے؟‘‘ یہ انسانی ذہن کے بہت قریب آ کر بات کرنے کا انداز ہے کہ تم دُنیوی کاروبار اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو خوب جانتے ہو‘ لیکن ایک کاروبار وہ بھی ہے کہ جس سے حاصل ہونے والا نفع عذابِ الیم سے چھٹکارے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس کاروبار کے نتیجے میں تم دردناک عذاب سے بچ جاؤ گے‘ جہنم کی آگ سے تمہیں رستگاری حاصل ہو جائے گی۔ یہ سوال کرنے کے بعد جواب بھی اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ تعلیم و تفہیم کا یہ بڑا ہی حکیمانہ انداز ہے کہ سوال کیا جائے اور پھر اس کا جواب دیا جائے گا۔

فرمایا: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ’’تم ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر‘‘۔ یہ مقام بھی ان مقامات میں سے ہے جہاں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ قانونی ایمان کچھ اور شے ہے اور حقیقی ایمان کچھ اور! خطاب اُن سے ہو رہا ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ پر غور کیجیے! فرمایا جا رہا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جو ایمان کا دعویٰ اور اس کا اعلان کر رہے ہو! اور اقرارٌ باللسان کا مرحلہ طے کر چکے ہو! تم اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہیں فی الواقع عذابِ الیم سے چھٹکارا ملے تو اس کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر یقین محکم رکھو۔ مزید یہ کہ: ﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ ’’اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ!‘‘ کھپاؤ اُس کی راہ میں اپنی جانیں بھی اور اپنے مال بھی۔ دیکھئے ’’فی سبیل اللہ‘‘ کا تعین پچھلی آیت میں کیا جا چکا ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اس نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ دے کر مبعوث کیے گئے ہیں‘ تمہیں اپنی جان اور اپنے مال کو لگانا اور کھپانا ہے۔ دین کو قائم و غالب کرنا اگرچہ اصلاً فرضِ منصبی ہے نبی اکرم ﷺ کا‘ لیکن اس کے غلبے کی جدوجہد میں تمہیں اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کرنا ہے اور اپنے خون سے اس انقلاب کی آبیاری کرنی ہے۔ تمہیں اس کی بنیادوں میں اپنی ہڈیوں اور خون کا گارا بھرنا ہوگا! یہ کام اسی طور سے ہوگا اور اسی میں درحقیقت تمہارے ایمان کا امتحان ہے۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجهاد والسیر‘ باب التحریض علی القتال۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجهاد والسیر‘ باب غزوة الاحزاب وهی الخندق۔

یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ واقعتاً ایمان تمہارے دلوں میں اتر گیا ہے۔

اس آیت میں گویا اسی مضمون کا اعادہ ہو گیا جو سورۃ الحجرات میں بیان ہو چکا ہے کہ:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾

کہ اپنے دعوائے ایمان میں صرف وہی لوگ سچے ہیں جو اِن دو شرائط کو پورا کریں: (i) یقینِ قلبی کی یہ صورت کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ان کا ایمان یقین کی شکل اختیار کر کے دل کے اندر جاگزیں ہو چکا ہو‘ اور (ii) اس یقین کا عملی مظہر ہوگا جہاد فی سبیل اللہ‘ اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے جان اور مال کا کھپانا۔ یہ ہے گویا کہ سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون جو آیت ۹ اور ۱۰ کے حوالے سے معین ہو گیا۔

اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کا ابتدا سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کے تین حصوں اور اُن میں شامل آیات کے باہمی ربط اور بالخصوص اس سورۃ کے مرکزی مضمون کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کو سمجھنا ہے۔ مرکزی مضمون کی تعیین کے بعد بقیہ آیات کو سمجھنا اِن شاء اللہ بہت آسان ہوگا۔

قول و فعل کے تضاد پر اللہ کا غضب

اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ چار آیات پر مشتمل ہے۔ پہلی آیت ہے:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

’’آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے‘ اور وہ زبردست کمالِ حکمت والا ہے‘‘۔

یہ ایک بڑا ہی پُرشکوہ آغازِ کلام ہے۔ جانتے ہو کون تم سے مخاطب ہے؟ وہ جو خالقِ ارض و سماء ہے‘ جس کی تسبیح و تحمید میں اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ لگا ہوا ہے۔ وہ العزیز ہے‘ زبردست ہے‘ اور الحکیم ہے‘ کمالِ حکمت والا ہے۔

اگلی آیت میں زجر اور ڈانٹ کا انداز ہے‘ مسلمانوں کو جھنجوڑا جا رہا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾

’’اے اہلِ ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟‘‘

تمہارے قول اور فعل کا یہ تضاد اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اگلے الفاظ بہت سخت ہیں:

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾

’’اللہ کے نزدیک یہ بات انتہائی بیزار کن ہے کہ تم کہو وہ کچھ جو کرتے نہیں ہو۔‘‘

’’مَقْتٌ‘‘ عربی زبان میں غیظ اور غصے سے بھی آگے کی کیفیت کے لیے آتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وقت آپ کی توقعات پر پورا نہ اترے تو آپ کو غصہ آتا ہے‘ لیکن ایک مرحلہ وہ آتا ہے کہ توقع بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ایک بیزاری کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ’’مَقْت‘‘ کا لفظ درحقیقت اسی کیفیت کا غماز ہے۔[1] یہ گویا انتہائی ملامت کا انداز ہے کہ تمہاری یہ لن ترانیاں‘ تمہارے محبتِ خداوندی اور عشقِ رسولؐ کے یہ دعوے تمہارے عمل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ دعوے اتنے بلند آہنگ ہوں اور عمل اس معیار پر پورا نہ اتر رہا ہو‘ اللہ کے ساتھ وفاداریاں اور رسولؐ کی فرمانبرداری نہ ہو رہی ہو‘ اللہ اور رسولؐ اور ان کے دین کے لیے حمیت اور غیرت موجود نہ ہو‘ دین حق کو پامال دیکھو اور اپنے دھندوں میں لگے رہو‘ اسے مغلوب پاؤ اور پھر بھی دنیا کمانے میں مصروف و مشغول رہو‘ یہ قول و فعل کا وہ تضاد ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی قابلِ مذمت اور بیزار کن ہے۔ ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ایمان لائے ہو تو اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا‘ خدا کو مانا ہے تو اس کے دین کے لیے جان اور مال کھپانے ہوں گے‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے تو آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنی جانیں اور اپنے مال صَرف کرنے ہوں گے۔ یا چناں کن یا چنیں! یا اس دعوے سے دستبردار ہو جاؤ‘ یا دعویٰ کرتے ہو تو اس کو عملاً پورا کرو! اقبال نے غالباً اسی

(۱) عرب میں ایک مکروہ رواج یہ تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے۔ تاہم ایسے نکاح کو اس معاشرے میں انتہائی ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کے لیے ’’نکاحِ مقت‘‘ کی اصطلاح مستعمل تھی۔

لیے کہا تھا :؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

اور:؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے.....

چوتھی آیت میں یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾

''اللہ کو تو محبت اُن سے ہے[1] جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں صفیں باندھ کر' ایسے گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہاں جہاد فی سبیل اللہ کے بلند ترین مقام یعنی قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ جہاد ایک وسیع اصطلاح ہے۔ دین کے لیے جِدّ وجُہد' محنت' کوشش اور دعوت وتبلیغ' سب جہاد ہی کی صورتیں ہیں۔ اسی طرح دین کی نشر واشاعت کے لیے محنت کرنا' لوگوں سے گفتگو کر کے انہیں ہم خیال بنانے کی ہر ممکن صورت کا اختیار کرنا' پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں انہیں منظّم کرنا اور ان کی مناسب تربیت کا اہتمام کرنا' یہ تمام کام جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہیں' لیکن اس تصادم اور کشمکش کا آخری مرحلہ اور اس کا نقطۂ عروج ہے قتال فی سبیل اللہ! یہاں اس کا ذکر کیا گیا' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ جا کدھر رہا ہے! جہاد فی سبیل اللہ کے جس راستے پر تم نے قدم دھرے ہیں اس کی آخری منزل کون سی ہے! چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾ قدم اس طرح سے جمے ہوئے ہوں اور صف بندی ایسی مضبوط ہو کہ جیسے کوئی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو کہ نہ اسے اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکے' نہ اس میں کہیں کوئی رخنہ پیدا کیا جا سکے۔

(۱) غالباً علامہ اقبال نے اپنے اس شعر کا اسلوبِ بیان اسی آیت مبارکہ سے اخذ کیا تھا کہ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

اسلام میں ''خیرِ اعلیٰ'' کا تصور

اس آیت کا حوالہ ہمارے منتخب نصاب کے بالکل آغاز میں آیۂ بِرّ کے ضمن میں آیا تھا کہ ہر نظامِ فکر کے نظریۂ اخلاق میں کسی نہ کسی خیرِ اعلیٰ (summum bonum) یا بالفاظِ دیگر کسی highest virtue کا تصور موجود ہوتا ہے کہ سب سے اعلیٰ قدر کون سی ہے' نیکی کی بلند ترین منزل کون سی ہے۔ نوٹ کیجیے کہ آیۂ بر (البقرۃ: ۱۷۷) کے اختتام پر جو مضمون آیا تھا اسی کا اعادہ سورۃ الصّف کی اس آیت میں ہوا ہے۔ وہاں نیکی کی بحث کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا: ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ﴾ ''اور صبر کرنے والے (ڈٹ جانے والے' برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرنے والے) فقر و فاقہ میں' تکلیف و اذیت میں اور لڑائی کے وقت (میدانِ جنگ میں)'' —— گویا اسلام کے نظامِ فکر اور اس کے نظریۂ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا خیرِ اعلیٰ (summum bonum) کا جو تصور ہے وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دینا ہے۔

بہر حال یہ پہلی چار آیات تمہید بن رہی ہیں اس مطالبۂ جہاد وقتال کی جو آگے آ رہا ہے۔ اگلی آیات میں بعثتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقصد اور مشن کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی جاتی ہے' لہٰذا آغاز میں تمہید کے طور پر یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جان لو کہ صرف زبانی اقرارِ ایمان تمہیں اللہ کے ہاں اُن وعدوں کا مستحق نہیں بنائے گا جو اُس نے اپنے مؤمن بندوں سے کیے ہیں' بلکہ قولی اقرار کے ساتھ ساتھ عمل کی گواہی بھی ضروری ہے' اور اس عمل کی چوٹی ہے قتال فی سبیل اللہ' جو بندۂ مؤمن کی عملی جدوجہد کا نقطۂ عروج ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ)) (۱) ''جس شخص کی موت اس حال میں واقع ہوئی کہ اس نے نہ تو کسی غزوے میں شرکت کی اور نہ ہی اس کے دل میں شہادت کی تمنا پیدا ہوئی تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی''۔ یہ درحقیقت ایمان کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ انسان کی ساری زندگی اللہ کی راہ میں مجاہدے اور جدوجہد میں گزرے، لیکن قتال کا مرحلہ نہ آئے۔ تاہم ایک بندۂ مؤمن کے سینے کو اِس آرزو سے آباد رہنا چاہیے کہ کاش کہ وہ وقت آئے کہ اپنی جان کا ہدیہ اللہ کے حضور میں پیش کر کے وہ سرخرو ہو جائے، سبکدوش ہو جائے۔ سورۃ الاحزاب میں اہل ایمان کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ (آیت ۲۳) کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بہت سے وہ ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے، راہِ حق میں گردنیں کٹوا کر سبکدوش ہو چکے اور باقی منتظر ہیں کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی اس امتحان میں سرخرو ہو جائیں!

یہود کا ذکر بطور نشانِ عبرت

اگلی چار آیات میں یہود کی تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے — اور یہ ان ''مُسَبِّحَات'' کے مشترک امور میں سے ہے کہ ان میں جا بجا بنی اسرائیل کو بطور نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے —— کہ اے مسلمانو! قول و عمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلوتہی، یہی وہ اصل جرم تھا کہ جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جس پر آج تم فائز کیے گئے ہو۔ چار آیات میں یہود کی تاریخ کے تین اَدوار کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔

''اور (یاد کرو) جب کہا تھا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اے میری قوم کے لوگو! کیوں مجھے ایذا پہنچاتے ہو درانحالیکہ تم خوب جان چکے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف؟ پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی کج کر دیا، اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

قوم کے جہاد سے انکار پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیزاری

اس آیۂ مبارکہ پر پہلے تو اس اعتبار سے غور کیجیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی اُمت کے ہاتھوں کس نوعیت کے دکھ سہنے پڑے ہوں گے! یقیناً کوئی نہ کوئی ذاتی اذیت بھی آپؑ کو پہنچائی گئی ہو گی، جیسے کہ خود نبی اکرم ﷺ کو اُن لوگوں کی زبان سے جو بظاہر کلمہ گو لیکن حقیقت کے اعتبار سے منافق تھے، انتہائی اذیت پہنچتی رہی، یہاں تک کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو اِس واقعہ سے کتنی کوفت اور کتنی ذہنی و قلبی اذیت پہنچی ہو گی۔ تو جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی کچھ اذیتیں بھی یہود کے ہاتھوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچی ہوں تو یہ کوئی بعید از قیاس نہیں ہے، لیکن ''اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے اصول کے تحت تلاش کیجیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کے ہاتھوں اصل اذیت کب پہنچی تھی، تو آپ کو سورۃ المائدۃ میں اس کی تفصیل ملے گی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی کے پھندوں سے نجات دلا کر لائے اور صحرائے سینا میں پڑاؤ کیا جہاں انہیں ''تورات'' عطا کی گئی، تو بالآخر جہاد و قتال کا مرحلہ سامنے آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ اب اس ارضِ مقدس یعنی فلسطین میں داخل ہو جاؤ، قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر ہمت کس لو تو قوم نے صاف جواب دے دیا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ ''(اے موسیٰ!) پس جاؤ تم اور تمہارا ربّ، تم دونوں قتال کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں!'' ہم اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس پر رنج و صدمے کی جو کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی اس کا نقشہ قرآن مجید نے کھینچا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے حد درجہ مایوسی اور بیزاری کا

اظہار کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ ''اے میرے پروردگار! مجھے خود اپنی اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی اختیار حاصل نہیں' پس تو اب ہمارے اور فاسقوں کی اس قوم کے درمیان تفریق کر دے''۔ (میں ان کے ساتھ مزید رہنے کے لیے تیار نہیں)۔ یہ گویا وہ سب سے بڑی اذیت تھی جو اپنی اُمت کے ہاتھوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھیلنی پڑی۔

اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی ایک اہم دفعہ

سورۃ الصّف کی آیت ۵ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ .....﴾ جس سلسلۂ کلام اور جس ربط کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئی ہے' اس کے مطابق اس کا اصل مفہوم واضح ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ بارہا عرض کیا گیا ہے' یہ بات پیشِ نظر رہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت اپنی جگہ علم وحکمت کا ایک مکمل موتی ہے۔ اسے جب ایک سلسلۂ مضمون کی کڑی میں پرویا جاتا ہے تو اس کا ایک مفہوم اور ایک رُخ متعین ہو جاتا ہے' لیکن اس کا کوئی دوسرا رُخ بھی ہو سکتا ہے جو اس سلسلۂ کلام کے اعتبار سے اگرچہ ضمنی قرار پائے گا لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہو گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم کے علوم و معارف کے بہت سے قیمتی موتی اسی طرح آیات کے ضمنی مضامین کی حیثیت سے وارد ہوئے ہیں۔

یہاں ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی کج کر دیا) کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی ایک بہت اہم دفعہ بیان ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ہدایت یا ضلالت میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار (choice) دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الدھر میں فرمایا گیا: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ ''خواہ وہ شکر بجا لانے والا بنے خواہ کفر کرنے والا''۔ چاہے اِدھر آ جائے' چاہے اُدھر چلا جائے۔ انسان اگر ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے لیے کھولتا چلا جائے گا' آسان کرتا چلا جائے گا' اور اگر وہ کج روی اختیار کرے گا تو وہی راستہ اس کے لیے آسان کر دیا جائے گا اور پھر اس پر وہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اور جب انسان غلط راستے پر پڑ جائے اور پھر اس پر بڑھتا چلا جائے تو ایک وقت ایسا آتا ہے جسے ہم انگریزی میں ''point of no return'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گویا آدمی اس درجے آگے نکل گیا کہ اب واپسی کا امکان ہی نہیں۔ اس مرحلے کو قرآن حکیم ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرۃ:۷)

''اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کی سماعت پر مہر لگا دی ہے' اور اُن کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔''

اسی کیفیت کے لیے یہاں ''اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ یعنی جب انہوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ اس لیے کہ اللہ کا یہ ضابطہ اور قانون ہے کہ وہ کسی کو بالجبر ہدایت کی راہ پر نہیں لانا چاہتا۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر فرما دیا گیا: ﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ﴾ یعنی اللہ ان لوگوں کو جو فسق و فجور ہی کی راہ اختیار کر لیں' جو کج روی کو پسند کر لیں' زبردستی ہدایت نہیں دیا کرتا۔

مذکورہ بالا آیۂ مبارکہ میں تاریخِ بنی اسرائیل کے ایک دَور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے' جب اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے مابین موجود تھے اور اس کے باوجود ان کا طرزِ عمل یہ تھا۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سے خطاب کر کے انہوں نے فرمایا: ''اے قوم! تُو تو اس چھنال کی مانند ہے کہ جو پہلی شب میں بے وفائی کی مرتکب ہوئی ہو!''

حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اور یہود کا معاندانہ رویّہ

اگلی آیت میں بنی اسرائیل کی تاریخ کی ایک جھلک دکھائی جا رہی ہے۔ یہ قوم اپنی اس کج روی میں اس حد تک بڑھ گئی کہ جب سلسلۂ بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء اور آخر الرُّسل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو آپؑ کے ساتھ بھی ان کا طرزِ عمل انتہائی

معاندانہ رہا۔فرمایا گیا:

﴿ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶ ﴾

''اور جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے کہ اے اولادِ یعقوب! میں تمہاری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں' میں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اس کی جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے اور بشارت دیتے ہوئے آیا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام ہے احمد (مجتبیٰ ﷺ)۔ پھر جب وہ ان کے پاس صریح نشانیوں کے ساتھ آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس ایسی کھلی کھلی نشانیاں اور معجزات لے کر آئے تھے جو پہلے کسی کو نہ دیے گئے تھے۔ حِسّی معجزات میں مُردوں کو زندہ کر دینے اور مٹی سے پرندوں کی تخلیق سے بڑھ کر کسی معجزے کا تصور نہیں کیا جا سکتا' لیکن علمائے یہود اور ان کے بڑے بڑے اصحابِ علم و فضل کی گراوٹ' ان کی پستی اور حق سے ان کے بُعد کا عالَم یہ ہو گیا کہ ایسے صریح معجزے دیکھ کر بھی ان بدبختوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے' اور چونکہ جادو کفر ہے' لہٰذا یہ مرتد ہے' اور واجب القتل ہے۔ تو بنی اسرائیل نے اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ یہ گویا تاریخِ بنی اسرائیل کا دوسرا دَور ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں بھی ایک مضمون' جو اِس سورۃ کے سلسلۂ کلام کی نسبت سے تو اگرچہ ضمنی کہلائے گا لیکن اپنی جگہ پر بہت اہم ہے' یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ایک عجیب شان کی حامل ہے۔ وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے' بلکہ شریعتِ موسوی ہی کی تجدید کے لیے آئے تھے۔ متی کی انجیل میں ''Sermon of the Mount'' میں ان کا یہ جملہ موجود ہے:

"Don't think I have come to destroy law."

یعنی ''کبھی یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت کو ختم کرنے آیا ہوں''۔ آپؑ شریعت کو ختم کرنے کے لیے نہیں' بلکہ شریعت کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کی ایک حیثیت ہے شریعتِ موسوی کے مجدّد کی اور ایک حیثیت ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے پیشرو اور آپؐ کے بارے میں بشارت و خوشخبری دینے والے کی۔ چنانچہ ﴿مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ کے الفاظِ مبارکہ میں بعثتِ عیسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو پہلو بھی بیان ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی جو رَوش رہی اس کو واضح کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ﴾

''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تراشے' جبکہ اسے اسلام کی طرف پکارا جا رہا ہو۔''

یہ آیت کچھ برزخی مزاج کی ہے۔ اس کا تعلق آیۂ ماسبق سے بھی جڑ جاتا ہے اور آیۂ مابعد سے بھی۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دَور میں یہود کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ بھی موجود ہے اور بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو اُن کا سلوک رہا' وہ بھی اس کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کریں' جبکہ انہیں اسلام کی طرف پکارا جا رہا ہو' اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو! حضرت مسیح علیہ السلام بھی دعوتِ اسلام لے کر آئے تھے اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ بھی دعوتِ اسلام لے کر آئے۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷﴾

''اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

ربطِ کلام کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ قول اور فعل کے تضاد سے کوئی اُمتِ مسلمہ پستی کی کس حد تک پہنچ سکتی ہے! اس کے لیے ایک نشانِ عبرت کے طور پر تاریخ

بنی اسرائیل کے یہ اَدوار سامنے لائے جا رہے ہیں۔

ع نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس میں یہود کے اس طرزِ عمل کا ذکر ہے جو انہوں نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اختیار کیا' اور جس کی طرف اشارہ اس سے پہلی آیت میں موجود ہے۔ یہود کی بدبختی اور بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ وہ خود منتظر تھے آخری نبی کی بعثت کے' اور ان سے یہ توقع تھی کہ وہ بڑھ کر آپ ﷺ کا استقبال کریں گے۔ ان کے کچھ قبیلے آ کر عرب میں آباد ہی اس لیے ہوئے کہ ان کی کتابوں میں یہ خبر تھی کہ کھجوروں کی سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ اس اُمید میں کہ ہم اس کا وقت پالیں اور اس کے ساتھی بن سکیں' ان کے کچھ قبیلے یہاں آ کر آباد ہوئے' اور وہ اوس وخزرج کے لوگوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ اس وقت تو تم ہم پر غالب ہو' ہمیں دبا لو جتنا چاہو' لیکن ایک وقت آنے والا ہے' اور وہ دُور نہیں' کہ نبی آخر الزّمان کا ظہور ہونے والا ہے' اور جب ہم ان کے ساتھ ہو کر تم سے جنگ کریں گے تو تم ہم پر غالب نہ آ سکو گے۔ لیکن یہود کی کہی ہوئی اسی بات کی وجہ سے اوس اور خزرج کے لوگ ایمان میں پیش قدمی کر گئے۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حج کے لیے آئے ہوئے مدینہ کے چھ افراد کے سامنے دعوت پیش کی تو انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آپس میں سرگوشی کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی رسول ہیں جن کا یہود حوالہ دیا کرتے ہیں اور جن کا ذکر کیا کرتے ہیں' اور آؤ اس سے پہلے کہ یہود پیش قدمی کریں' ہم اُن پر سبقت کریں اور ایمان لے آئیں۔ تو اللہ نے انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز فرما دیا اور یہود اس نعمت سے محروم رہے' اور نہ صرف محروم رہے بلکہ یہ قوم نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور آپؐ کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں کھلے کھلے کافروں اور مشرکوں کو مات کر گئی۔ یہاں قرآن نے ان پر ایک تعریض کے انداز میں ان کی جو اصل صورت حال تھی' اس کا نقشہ اِن عجیب الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں''۔

مولانا ظفر علی خاں نے دراصل یہیں سے اپنے اس شعر کے لیے خیال اخذ کیا ہے:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ کے الفاظ میں خاص طور پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہود کبھی بھی کھلے میدان میں رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ابوجہل مقابلے پر آیا تو مرنے اور مارنے کے لیے آیا اور اس نے اپنی گردن کٹا لی۔ لیکن یہود میں یہ حوصلہ نہ تھا۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اے نبی! یہ یہودی کبھی آپ کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلے پر نہ آئیں گے۔ ان کا سارا معاملہ کہیں دیواروں کے پیچھے سے اپنا تحفظ لے کر' کہیں چھتوں کے اوپر سے پتھر برسا کر یا دوسروں کو ابھار کر اور اشتعال دلا کر آپ کے خلاف اکسانے کی طرح کا ہی ہوگا۔ یہاں اسی کی طرف تعریض کے انداز میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾

''اور اللہ تو اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا' اگرچہ یہ کافروں کو کیسا ہی ناگوار گزرے''۔

اللہ کا یہ اٹل فیصلہ ہے اور تاریخِ نسلِ انسانی کا وہ وقت آ چکا ہے کہ اس نور کا اتمام کر دیا جائے' اس ہدایت کی تکمیل ہو جائے' وہ وقت آ جائے جبکہ اعلانِ عام ہو کہ ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدۃ:۳) اور اللہ کا یہ اٹل فیصلہ پورا ہو کر رہے گا۔ بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حکمتِ خداوندی کے اسی تقاضے کے تحت ہوئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ

﴿كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ' تاکہ وہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین پر' خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے''۔

عالمِ واقعہ میں اللہ کے نور کے اتمام کی صورت یہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو جو ''الہدیٰ'' یعنی قرآن مجید دے کر بھیجا ہے' اس کا نور عام ہوگا۔ اس عالم میں اس قرآن مجید کا چرچا ہوگا۔ محمد ﷺ اس قرآن کی مکمل طور پر تبلیغ فرمائیں گے اور اس کے ساتھ دینِ حق یعنی جو نظامِ عدل وقسط دے کر وہ بھیجے گئے ہیں' اسے قائم و نافذ کر کے نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت فرما دیں گے۔ اسی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ.....﴾ یعنی دین کی تکمیل اور نوعِ انسانی پر نعمتِ خداوندی کا اتمام بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں ہو کر رہے گا۔

کارِ رسالت کی تکمیل کے لیے اہل ایمان کی ذمہ داریاں

اس کے بعد اب وہ آیت آ رہی ہے جس کا اس درس کے آغاز میں حوالہ دیا گیا تھا۔ جب اللہ کا اٹل فیصلہ یہ ہے تو اب اس کے لیے اہل ایمان کو جان اور مال کھپانا ہے۔ چنانچہ یہاں اہل ایمان کو اس کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے دو انداز ہوتے ہیں۔ ایک ترغیب وتشویق کا انداز ہے کہ یہ کرو گے تو یہ اجر ملے گا' یہ بدلہ ملے گا' یوں شاباش ملے گی' اس طرح تمہاری خدمات کا اعتراف کیا جائے گا' تمہیں ان خلعتوں سے نوازا جائے گا' اور دوسرا انداز یہ کہ اگر نہ کرو گے تو یہ سزا ملے گی۔ ان میں سے پہلا تشویق کا انداز ہے اور دوسرے کے اندر دھمکی اور وعید کا پہلو ہے۔ اس لیے پہلے کو ''ترغیب'' اور دوسرے کو ''ترہیب'' کہا جاتا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے عین مرکز میں بعثتِ محمدیؐ کا مقصد معین ہوا ہے۔ اس کے لیے یہاں اہل ایمان کو جہاد کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس کے لیے ترغیب اور ترہیب کے دونوں انداز اختیار کیے جا رہے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع بھی ترہیب پر مشتمل تھا کہ اگر دین کے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہو گے تو قول وعمل کے تضاد کے مرتکب گردانے جاؤ گے' اللہ تمہارے طرزِ عمل سے بیزار ہوگا اور تم اس کے غضب کے مستحق ٹھہرو گے' اور اس طرح تم گویا یہود کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے جنہوں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا اور وہ اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جہاں آج تمہارا تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔

دوسرے رکوع میں ترغیب کا انداز غالب ہے' اگرچہ اس کی ابتدا بھی ترہیب سے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

''اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک عذاب سے چھٹکارا دے دے؟''

گویا یہاں یہ بات خود بخود عیاں (implied) ہے کہ اگر تم یہ نہ کرو گے تو چھٹکارا پانے کی کوئی اُمید نہیں۔ اگر تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ محض یہ کہنے سے کہ ''ہم ایمان لے آئے'' چھٹکارا ہو جائے گا' تو یہ اُمید موہوم ہے' خیالِ خام ہے۔ جیسے سورۃ العنکبوت کے بالکل شروع میں الفاظ آئے ہیں:

﴿الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ﴾

''ا'ل'م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے' اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟''

انہیں پرکھا نہ جائے گا' ان کی آزمائش نہ کی جائے گی' انہیں جانچا نہ جائے گا' انہیں امتحانوں کی بھٹیوں میں ڈالا نہ جائے گا؟ وہی بات یہاں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے' چھٹکارا ہو جائے گا تو یہ خیالِ خام ہے۔ اگر عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو ایک کاروبار کرنا پڑے گا'

ایک مشقت جھیلنی پڑے گی‘ ایک محنت کرنی ہوگی۔ اور وہ یہ کہ:

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾

’’ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر‘ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔‘‘

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

’’یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو۔‘‘

اگر تم واقعی علم رکھتے ہو‘ اگر ہوش مند ہو‘ باشعور ہو‘ نفع اور نقصان کا صحیح فہم تمہیں حاصل ہے تو جان لو کہ یہی بہتر ہے۔ اپنی جان کا اللہ کی راہ میں دے دینا درحقیقت اس جان کو ہمیشہ کے لیے جاوداں بنالینا ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ ’’اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے ہیں انہیں مُردہ مت کہو‘ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (اُن کی زندگی کا) شعور نہیں ہے‘‘۔ اسی طرح اگرچہ بظاہر مال سے محبت ہے‘ اور اس کو جمع کر کے سینت سینت کر رکھنے کی طرف طبیعت کا میلان ہے‘ لیکن اگر تم حقیقت شناس اور حقیقت بین ہو تو جان لو کہ اللہ کے راستے میں‘ اس کے دین کی سربلندی کے لیے اس کا کھپا دینا اور لگا دینا ہی بہتر ہے۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے انعاماتِ ربّانی

اگلی دو آیات گویا اسی آخری ٹکڑے ﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ کی شرح ہیں‘ جن میں ’’ترغیب‘‘ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک کے بعد دوسرے انعام اور اعلیٰ مراتب کا ذکر ہے کہ اگر یہ کرو گے تو کیا کیا کچھ ملے گا۔ تو سب سے پہلے فرمایا:

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ ’’وہ تمہاری خطائیں معاف فرمائے گا‘‘۔

یعنی اگر تم اس راستے پر قدم بڑھاتے چلو اور اس سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش نہ کرو‘ اس فرضِ منصبی کی ادائیگی سے پہلوتہی نہ ہو‘ تو پھر اگر کہیں کوئی لغزش یا خطا ہو بھی گئی تو اللہ کا پہلا وعدہ تو یہ ہے کہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا‘ تمہاری غلطیوں کو معاف فرما دے گا‘ تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گا۔ مزید برآں یہ کہ:

﴿وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ﴾

’’اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘ اور ان پاکیزہ گھروں میں جو جنّاتِ عدن میں ہیں‘‘۔

یعنی ہمیشہ باقی رہنے والے رہائشی باغات (residential gardens) میں تمہیں اعلیٰ مسکن عطا فرمائے گا۔

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾﴾ ’’یہ ہے اصل کامیابی!‘‘

یہ ہے اصل فوز و فلاح۔ یعنی اصل کامیابی و کامرانی آخرت کی کامیابی ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو پورے شدّ ومدّ (emphasis) کے ساتھ سورۃ التغابن میں بیان ہو چکا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ (آیت ۹) ’’وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن‘‘۔ جو اُس روز جیتا وہ جیتا‘ اور جو اس روز ہارا وہ ہارا۔ جو اُس روز کامیاب قرار دیا گیا وہی کامیاب ہے اور جو اُس روز ناکام قرار پایا وہی ناکام ہے۔ چنانچہ اصل کامیابی یہی ہے‘ بڑی کامیابی یہی ہے۔

نصرتِ خداوندی اور فتح قریب کا وعدہ

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ﴾ ’’اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت محبوب ہے‘‘۔

یہ بڑا ہی عجیب اور قابلِ توجہ پیرایۂ کلام ہے۔ اللہ کے نزدیک تو اصل کامیابی وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا‘ لیکن ایک اور چیز کا بھی وعدہ ہے‘ جو تمہیں بہت محبوب ہے‘ اور وہ ہے:

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾

’’اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی۔‘‘

یعنی اللہ کی طرف سے مدد کا وعدہ بھی ہے اور اس فتح کا بھی جو زیادہ دُور نہیں ہے‘ اب یہ

مرحلہ آیا چاہتا ہے' اللہ کے دین کا غلبہ ہوا چاہتا ہے۔ درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے زمانۂ نزول کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو اِن آیات کا مفہوم صحیح طور پر سامنے آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیات غزوۂ احزاب کے فوراً بعد نازل ہوئیں۔ غزوۂ احزاب رسول اللہ ﷺ کی اس جدّ وجہد' کشمکش اور انقلابی دعوت میں ایک فیصلہ کن موڑ (turning point) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد نظر آ رہا تھا کہ گویا اب صورتِ حال تبدیل ہو جانے والی ہے۔ (Tables were to be turned) اس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احزاب کے فوراً بعد ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: ((لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))(۱) یعنی اے مسلمانو! اِس سال کے بعد اب قریش تم پر قطعاً حملہ آور نہیں ہوں گے بلکہ اب تم ان پر جنگ مسلط کرو گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا' کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے' اب اقدام تمہاری طرف سے ہوگا۔ اسی کا گویا نقشہ ہے جو اس آیۂ مبارکہ کے الفاظ میں سامنے آ رہا ہے۔ اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کے وعدے کے ساتھ فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾

''اور (اے نبیؐ!) اہل ایمان کو بشارت دے دیجیے!''

نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا فرمانِ مبارک اور اس آیۂ مبارکہ کے مابین ایک گہرا منطقی ربط معلوم ہوتا ہے اور آپ ﷺ کا وہ قول اغلباً ——— واللہ اعلم ——— اسی آیۂ مبارکہ کے نزول کے بعد کی بشارت محسوس ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت دیجیے کہ اب وہ مرحلہ دُور نہیں ہے۔ اب اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے اور فتح تمہارے قدم چومنے کو ہے۔ لیکن اس پورے معاملے کو ''اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے کہ تم کامیاب ہوتے ہو یا ناکام! اس کے نزدیک تو اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ بندۂ مؤمن کا فرض ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسے اللہ کی راہ میں لگا دے اور اپنے تمام وسائل میدان میں لا ڈالے۔ دنیا میں وہ کامیاب ہوتا ہے یا ناکام' اس سے اس کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ یومِ اُحد ہی کو شہید ہو گئے اور انہوں نے دین کا غلبہ اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے وہ دَور نہیں دیکھا جب اللہ کے دین کا جھنڈا لہرا رہا تھا' جب محمدٌ رسول اللہ ﷺ میدانِ عرفات میں یا وادیٔ منیٰ میں سوا لاکھ کے مجمع کو خطاب فرما رہے تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ناکام ہوئے۔ **نعوذ باللّٰہ من ذٰلک!** یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دو وعدوں کو علیحدہ علیحدہ گروپ کیا گیا ہے۔ پہلا وعدہ خطاؤں کی بخشش اور داخلۂ جنت کا ہے' جسے ''اصل کامیابی'' قرار دیا گیا ہے' اور دوسرا وعدہ اور خوشخبری ایک ایسی چیز کے بارے میں ہے جس کے لیے فرمایا گیا کہ ''جو تمہیں بہت پسند ہے''۔ انسان بر بنائے طبعِ بشری اپنی جدّ وجُہد کے نتائج کو دیکھنا چاہتا ہے' اپنی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوئے دیکھنے کی خواہش انسان میں فطری طور پر ہوتی ہے۔ یہاں اس کی طرف اشارہ فرما دیا گیا۔

''كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ'' کی پکار

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت کا مطالعہ کرتے ہیں جو ایک طویل آیت ہے۔ اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلۂ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو.....''

اس کا تعلق اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے ساتھ جوڑیئے۔ وہاں فرمایا گیا تھا: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱﴾ کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول ہے اور وہ زبردست ہے' توانا ہے' غالب ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔ اس کی حکومت اس پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے' اسے کسی کی نصرت کی کوئی احتیاج نہیں۔ وہ (معاذ اللہ) ضعیف نہیں ہے کہ اسے کسی کی مدد کی احتیاج ہو۔ بایں ہمہ اگر بندۂ مؤمن اس کے دین کے غلبے کے لیے سعی کر رہا ہو'

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳۹۶/۶

اس کے دین کی سربلندی کے لیے جان اور مال کھپا رہا ہو‘ اس کے رسول کے مشن کی تکمیل کے لیے جسم و جان کی توانائیوں کو صرف کر رہا ہو‘ اپنے مال و اسباب اور وسائل و ذرائع کو اس کی راہ میں خرچ کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حد تک حوصلہ افزائی فرماتے ہیں کہ اس کی اس جدّ و جہد کو اپنی نصرت سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور بندے کے لیے اس سے اونچا مقام اور کوئی نہیں ہے کہ مخلوق ہو کر خالق کا مددگار قرار پائے‘ عبد ہوتے ہوئے معبود کا مددگار قرار پائے‘ اور معبود اپنے بندوں سے کہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾

’’اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو!‘‘

اس کے لیے اب یہاں تاریخ سے شواہد لائے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ جہاں بہت سی پستیوں کی امین ہے‘ وہاں اس میں رفعتیں بھی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے ع ’’ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما‘‘ کے مصداق حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد اُن کے پیغام کی نشر و اشاعت میں جس تندہی کے ساتھ محنتیں کی ہیں‘ جو کوششیں کی ہیں‘ جس طرح کے مصائب جھیلے ہیں‘ جس طرح کی صعوبتیں اور شدائد برداشت کیے ہیں‘ وہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا اس پہلو سے ایک بڑا درخشاں باب ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾

’’جیسے کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟‘‘

چونکہ یہ کام اللہ کا ہے‘ اللہ کے دین کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت مقصود ہے‘ لہٰذا اسے ’’اللہ کی طرف نصرت‘‘ سے تعبیر فرمایا۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقصد اور اس کی غرض و غایت کو سامنے رکھیے تو کہا جائے گا کہ کون ہے جو اللہ کے دین کے غلبے اور اس کی سربلندی کی جدّ و جُہد میں میرا مددگار رہو‘ میرا دست و بازو بنے‘ میرا ممدّ و معاون ہو‘ اس راہ میں میرا ساتھ دے؟

آپ نے دیکھا کہ ﴿كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ اور ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ میں نصرت کی دونوں نسبتیں آ گئی ہیں‘ ایک نسبت اللہ کی طرف اور دوسری رسول کی طرف۔ یعنی اللہ کی نصرت بایں معنی کہ دین اللہ کا ہے‘ اور رسولؐ کی نصرت اس حوالے سے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اصلاً رسول کا فرضِ منصبی ہے۔ یہ دونوں نسبتیں ہمارے منتخب نصاب کے آخری مقام سورۃ الحدید میں اِن الفاظ میں بیان ہوئی ہیں: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ (آیت ۲۵) کہ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ جان نثار اور وفادار بندے جو غیب میں رہتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ تو یہ نصرتِ خداوندی اور نصرتِ رُسل ہی گویا جہاد فی سبیل اللہ کی اصل ماہیت‘ اس کی اصل حقیقت‘ اس کا لبِّ لباب اور اس کا خلاصہ ہے۔ آگے ’’مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ‘‘ کے جواب میں حواریینِ مسیحؑ کا جواب نقل ہوا ہے:

﴿ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾

’’حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے!‘‘

﴿فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ﴾

’’پھر بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا (حضرت مسیح علیہ السلام پر) اور ایک گروہ کفر پر اڑا رہا۔‘‘

اللہ کی تائید سے اہل ایمان کا غلبہ

﴿فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾﴾

’’تو ہم نے تائید فرمائی ان کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں‘ اور (بالآخر) وہی غالب ہوئے!‘‘

یہاں ﴿فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ﴾ میں وہی لفظ ’’اظہار‘‘ اسم فاعل کی شکل میں آیا ہے جو ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ میں بطورِ فعل آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسول کا انکار کرنے والے یہودی مغلوب ہوئے۔ اور تاریخ میں پھر وہ اَدوار بھی آئے کہ جن میں ان کے لیے اپنا کوئی تشخص برقرار رکھنا بغیر اس کے ممکن نہیں رہا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام

لیواؤں کی پناہ میں آ ئیں اور ان کے دامن میں اپنے آپ کو چھپائیں۔ تاریخِ انسانی کے دوران وقفے وقفے کے بعد اُن پر عذابِ خداوندی کے کوڑے بھی برستے رہے۔ کبھی بخت نصر کے حملے کی صورت میں ان پر عذابِ الٰہی آیا اور کبھی ٹائٹس رومی کی صورت میں ان پر قہرِ خداوندی نازل ہوا۔ بیسویں صدی میں ہٹلر کے ہاتھوں ان پر قیامت ٹوٹی۔ لیکن بہرحال تاریخ کی یہ انمٹ شہادت ہے کہ وہ اُس وقت سے ہمیشہ مغلوب ہی رہے ہیں۔ اس وقت بظاہر دنیا میں ان کی کچھ چلت پھرت اور کچھ حیثیت و مقام نظر آتا ہے' لیکن وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کے طفیل اور اُن کے سہارے پر ہے۔ اور اگر یہ آج کچھ ناچ رہے ہیں تو انہی کے کھونٹے پر جو اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح معنوں میں متّبعین نہیں ہیں' لیکن بہرحال ان کے نام لیوا ہیں۔

یہاں یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوتی ہے۔ اب چند جملوں میں اس کا لبِّ لباب ذہن نشین کر لیجیے۔ سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون ہے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت اور اس کی تکمیلی اور امتیازی شان' یعنی وہ دینِ حق جو آپؐ دے کر بھیجے گئے اسے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم کرنا' غالب کرنا' رائج کرنا' نافذ کرنا۔ اور وہ جو ایمان رکھتے ہوں اللہ پر اور ایمان رکھتے ہوں محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر' ان کا فرضِ منصبی ہے اس مقصد کے لیے جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنا۔ وہ اگر یہ کرتے ہیں تو ان کے لیے سب کچھ ہے' مغفرت بھی ہے اور ہمیشہ ساتھ رہنے والے رہائشی باغات میں ان کو بہترین ٹھکانے بھی میسر آ جائیں گے۔ ان پر اللہ کی طرف سے انعام و اکرام اور اعزاز کی بارش ہوگی۔ پھر مزید یہ کہ اس دنیا میں بھی نصرت اور فتح کے وعدے ہیں۔ اور مزید برآں ان کی اس طرح قدر افزائی ہوگی اور وہ بلند مقام انہیں ملے گا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مددگار قرار پائیں گے۔ اور اگر نہیں کرتے تو عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے کی امید بھی موہوم ہے' بلکہ یہ اللہ کے غضب کو بھڑکا دینے والی بات ہے کہ انسان زبان سے دعوائے ایمان کرے' اللہ اور اس کے رسول کو ماننے کا اقرار کرے اور بالفعل اس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دے!!

❁❁❁